انگارے

دس مختصر کہانیوں کا مجموعہ

از

سید سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں، محمود الظفر

پبلشر سید سجاد ظہیر، بٹلر گنج، لکھنؤ

باہتمام مرزا محمد جواد نظامی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ میں چھپا

بار اوّل — تعداد اشاعت ۱۰۰۰ — قیمت ۸؍

افسانہ	مصنف	صفحہ
نیند نہیں آتی	سید سجاد ظہیر	۱ ...... ۱۹
جنت کی بشارت		۲۰ ...... ۳۰
گرمیوں کی ایک رات	"	۳۱ ...... ۴۳
دُلاری	"	۴۴ ...... ۵۲
پھر یہ ہنگامہ —	"	۵۳ ...... ۶۷
بادل نہیں آتے	احمد علی	۶۸ ...... ۷۹
مہاوٹوں کی ایک رات	"	۸۰ ...... ۹۱
دلّی کی سیر	رشید جہاں	۹۲ ...... ۹۷
پردے کے پیچھے	"	۹۸ ...... ۱۲۰
جوانمردی	محمود الظفر	۱۲۱ ...... ۱۳۴

نیند نہیں آتی

گھڑ گھڑ گھڑ گھڑ، ٹخ، ٹخ، چٹ، ٹخ ٹخ ٹخ،
چٹ چٹ چٹ۔

گذر گیا ہے زمانہ گلے لگائے ہوئے۔ ے...... ے ......
خاموشی اور تاریکی۔ تاریکی، تاریکی۔ آنکھ ایک پل کے بعد کھلی،
تکیہ کے غلاف کی سفیدی، تاریکی، مگر بالکل تاریکی نہیں ......
پھر آنکھ بند ہوگئی۔ مگر پوری تاریکی نہیں۔ آنکھ دبا کر بند کی،
پھر بھی روشنی آہی جاتی ہے۔ پوری تاریکی کیوں نہیں ہوتی؟
کیوں نہیں؟ کیوں نہیں؟

بڑا میرا دوست بنتا ہے، جب ملاقات ہوئی، آیئے اکبر بھائی،

آپکے دیکھنے کو تو آنکھیں ترس گئیں۔ ہیں ہیں ہیں۔ کچھ تازہ کلام سنایئے......
......لیجئے سگرٹ نوش فرمایئے، مگر سمجھتا ہے، شعر خوب سمجھتا ہے۔ وہ دوسرا
الّو کا پٹھا تو بالکل حنسر دماغ ہے۔ اخاہ! آج تو آپ نئی اچکن پہنے ہیں۔
نئی اچکن پہنے ہیں ...... تیرے باپ کا کیا بگڑتا ہے جو میں نئی
اچکن پہنے ہوں۔ تو چاہتا ہے کہ بس ایک تیرے ہی پاس نئی اچکن ہو۔
اور شعر سمجھنا تو درکنار صحیح پڑھ بھی نہیں سکتا۔ ناک میں دم کردیتا ہے۔
بیہودہ، بدتمیز کہیں کا! مگر بڑا بھائی میرا دوست بنتا ہے۔ ایسوں کی
دوستی کیا! میری باتوں سے اسکا دل ذرا بہل جاتا ہے، بس، یہی
دوستی ہے۔ مفت کا مصاحب ملا، چلو مزے ہیں...... خدا بچھ کرے
غیبر نہ کرے، دوسروں کی خوشامد کرتے کرتے زبان گھس جاتی ہے،
اور وہ ہیں کہ چار پیسے جو جیب میں ہم سے زیادہ ہیں تو مزاج ہی نہیں ملتے۔
میں نے آخر ایک دن کہہ دیا کہ میں نوکر ہوں، کوئی آپکا غلام نہیں ہوں،
تو کیا آنکھیں نکال کر لگا مجھے دیکھنے۔ بس جی میں آیا کہ کان پکڑ کے
ایک چانٹا رسید کردوں، سالے کا مزاج درست ہوجائے۔

ٹپ ٹپ کھٹ ٹپ ٹپ کھٹ ٹپ ٹپ کھٹ، ٹپ ٹپ
ٹپ...... ٹ......

اسوقت رات کو یہ آخر کون جا رہا ہے؟ مرن ہے اسکی، اور کہیں
پانی برسنے لگے تو اور مزہ ہے۔ لکھنؤ میں جب میں تھا۔ ایک جلسہ میں،
موسلا دھار بارش۔ امین الدولہ پارک تالاب معلوم ہوتا تھا۔ مگر لوگ
ہیں کہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ اور کیا ہے کیا جو یوں
سب جان پر کھیلنے کو تیار ہیں۔ مہاتما گاندھی کے آنے کا انتظار ہے
اب آئیں، تب آئیں، وہ آئے، آئے، آئے۔ وہ مچان پر
مہاتما جی پہونچے...... جے، جے، جے، خاموشی۔
: میں آپ لوگوں سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ لوگ بدیشی کاپڑ
پہننا بالکل چھوڑ دیں۔ یہ سیطانی گورن منٹ ....
یہاں پانی سیکر ہوکر پیروں سے پرنالوں کی طرح بہنے لگا۔ قدرت
موت رہی تھی۔ سیطانی گورنمنٹ، شیطانی، گورنمنٹ کی نانی۔ اس
گاندھی سے شیطانی گورنمنٹ کی نانی مرتی ہے۔ اہاہا، شیطانی اور

نانی...... اکبر صاحب، آپ تو ماشاءاللہ شاعر ہیں، کوئی قومی نظم
تصنیف فرمائیے، یہ گل و بلبل کے افسانے کب تک۔ قوم کی ایسی تیسی!
میرے ساتھ قوم نے کیا اچھا سلوک کیا ہے کہ میں گل و بلبل چھوڑ کر قوم کے
آگے بھر کروں۔

مگر میں یہ کہتا ہوں کہ میں نے آخر کسی کے ساتھ کیا برا سلوک کیا ہے کہ
سارا زمانہ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑا ہے۔ میرے کپڑے میلے ہیں
...... ان سے بدبو آتی ہے...... بدبو ہی۔ میری ٹوپی دیکھ کر کہنے لگا
کہ تیل کا دھبہ پڑ گیا، نئی ٹوپی کیوں نہیں خریدتے؟ کیوں خریدوں
نئی ٹوپی۔ نئی ٹوپی۔ نئی ٹوپی۔ نئی ٹوپی میں کیا سرخاب کا پر لگا ہے!

انگشت نما تھی کج کلاہی جنکی　　وہ جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں آج
ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو............

واہ وا واہ! کیا بے تکا پن ہے۔ جارج پنجم کے تاج میں
ہمارا ہندوستانی ہیرا ہے۔ لے گئے چرا کے انگریز، رہ گئے تا منہ دیکھتے!
اڑ گئی سونے کی چڑیا رہ گئی دم ہاتھ میں۔ اب چاہتے کہ دم بھی ہاتھ سے

نکل جاے۔ دُم نہ چھوٹنے پاۓ۔ شاباش ہے میرے پہلوان! لگاۓ جا زور! دُم چھوٹی تو عزت گئی۔ کیا کہا؟ عزت؟ عزت لے کے چاٹنا ہے۔ سُوکھی روٹی اور نمک کھا کر کیا بانکا جسم نکل آیا ہے۔ فاقہ ہو تو پھر کیا کہنا، اور اچھا ہے۔ پھر تو بس عزت ہے اور عزت کے اوپر خداوند پاک.........

خداوند پاک، اللہ، باری تعالیٰ، رب العزت، پرمیشر، پرماتما، لاکھ نام لے جاؤ۔ جلدی، جلدی، جلدی اور جلدی۔ کیا ہوا؟ روحانی سکون؟ بس تمہارے لئے یہی کافی ہے۔ مگر میرے پیٹ میں تو دوزخ ہے۔ دُعا کرنے سے پیٹ نہیں بھرتا، پیٹ سے ہوا نکل جاتی ہے۔ بھوک اور زیادہ معلوم ہونے لگتی ہے۔

بھوں، بھوں، بھوں.........

اب اِن کا بھونکنا شروع ہوا تو رات بھر جاری رہے گا۔ مچھر الگ ستا رہے ہیں۔ توبہ ہے توبہ! ایک جالی کا پردہ گرمیوں میں بہت آرام دیتا ہے۔ مچھروں سے نجات ملتی ہے۔ مگر گیا، نجات کیا! دن بھر کی مشقت، چیخ پکار، کڑی دھوپ میں گھنٹوں ایک جگہ سے دوسری جگہ

گھومتے گھومتے جان نکل جاتی ہے۔ اماں کہا کرتی تھیں، اکبر دھوپ میں مت دوڑ، آ، میرے پاس آ کے لیٹ بچے! لو لگ جاۓ گی تجھے بچے۔ ایک مدت ہو گئی اسے بھی۔ اب تو یہ باتیں خواب معلوم ہوتی ہیں۔ اور مولوی صاحب ہمیشہ میری تعریف کرتے تھے: دیکھو نالائقو، اکبر کو دیکھو، اسے شوق ہے علم کا۔ خواب، وہ سب باتیں خواب معلوم ہوتی ہیں۔ بس بستہ تختی لئے دوڑتا ہوا واپس آتا تھا۔ اماں گود سے چمٹا لیتی تھیں۔ مگر کیا آرام تھا! اُس وقت بھی کیا آرام تھا! یہ سب چیزیں میری قسمت میں ہی نہیں تھیں۔ مگر جو مصیبت میں برداشت کر چکا شاید ہی کسی کو اُٹھانی پڑی ہوں۔ اِسے یاد کرنے سے فائدہ؟ خیراتی اسپتال، نرسیں، ڈاکٹر، سب ناک بھوں چڑھاے اور اماں کا یہ حال کہ کروٹ لینا محال۔ اور اُن کے اُگالدان میں خون کے ڈلے کے ڈلے۔ معلوم ہوتا تھا کہ گوشت کے لوتھڑے ہیں.........

اور میں سب کو خط پہ خط لکھتا تھا۔ یہی سب جو رشتہ دار بنتے ہیں! آئیے اکبر بھائی آئیے! آپ سے تو برسوں سے ملاقات نہیں ہوئی.........

.........یہی! انھیں کے ماں، باپ۔ کیا ہو جاتا اگر ذرا اور مدد کر دیتے۔

دُنیا بھر کی خرافات پر پانی کی طرح دولت بہاتے ہیں۔ کسی رشتہ دار کی
مدد کرتے وقت ٹل ٹل کر پیسہ دیتے ہیں۔ اور پھر احسان جتانا اتنا کہ خدا
کی پناہ! ایک دن میں کہیں باہر گیا ہوا تھا، انھیں صاحبزادے کی
والدہ، اماں کو دیکھنے آئیں۔ میں جب پہونچا تو انھیں آئے ہوئے چند
ہی منٹ ہوئے تھے۔ چہرہ سے ٹپک رہا تھا کہ انھیں ڈر ہے جراثیم ان کے
سینے کے اندر نہ گھس جائیں۔ مگر بیمار کو دیکھنے آنا فرض ہے! ثواب کا کام
ہے! یہ سب تو سب اُلٹے مجھے ڈانٹنا شروع کیا: کہاں گئے تھے تم اپنی والدہ
کو چھوڑ کر۔ ان کی حالت ایسی نہیں کہ انھیں اس طرح سے چھوڑا جائے......
...... مریض کے منہ پر اس طرح کی باتیں! میں غصہ سے کھولنے لگا، مگر
مرتا کیا نہ کرتا۔ اسپتال کا خرچ انھیں لوگوں سے لینا تھا۔ میرے بیوی بچے کا ٹھکانا
انھیں کے یہاں تھا...... میری شادی کی جس نے سُنا مخالفت کی۔ لیکن
اماں بیچاری کا سب سے بڑا ارمان میری شادی تھی؛ اکبر کی دُلھن بیاہ کے لاؤں،
بس میری یہ آخری تمنا ہے۔ لوگ کہتے تھے کہ گھر میں کھلانے کو نہیں۔ شادی
کس بُوتے پر کروگی۔ اماں کہتی تھیں کہ خدا رازق ہے۔ جب میری نسبت

طے ہوگئی، شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی، شادی کا دن آگیا، تو وہی لوگ جو
مخالفت کرتے تھے سب برات میں جانے کو تیار ہو کر آگئے۔ ساری کچی بچائی
پونجی اماں کی مہمانداری اور شادی کے لوازمات میں خرچ ہوگئی۔ گیس کی
روشنی، ریشمی اچکنیں، پلاؤ، باجہ، مسند، ہنسی مذاق، بھیڑ۔ کھانے
میں کمی پڑ گئی۔ باورچی نے چوری کی۔ بادشاہ علی صاحب کا جوتا چوری گیا
زمین آسمان کے قلابے ملادیے۔ ابے اُلّو کے پٹھے تو نے جوتا سنبھال کے
کیوں نہیں رکھا۔ جی حضور! قصور میرا نہیں...... مہر کا جھگڑا ہونا شروع
ہوا۔ موجل اور معجل کی بحث۔ مُنھ دکھائی کی رسم، سلام کرائی کی رسم۔ مذاق،
پھول، گالی گلوج۔ شادی ہوگئی۔ اماں کا ارمان پورا ہوگیا...... محترم علی
بیچارا چالیس برس کا ہوگیا اس کی شادی نہیں ہوئی۔ اکبر میاں شادی کروا
دیجئے، شیطان رات کو بہت ستاتا ہے۔ شادی، خوشی۔ کوئی ہمدرد
بات کرنے والا جس سے اپنے دل کی ساری باتیں اکیلے سُنادیں۔ کوئی
عورت جس سے محبت کرسکیں، دو گھڑی ہنسیں بولیں، چھاتی سے لگائیں
پیار کریں...... ارے مان بھی جاؤ میری جان! میری پیاری،

میری سب کچھ۔ زبان بیکار ہے۔ ہاتھ، پیر، سارا جسم، جسم کا ایک ایک
رونگٹا......... کیوں آج مجھ سے خفا ہو؟ بولو! ارے تم نے تو رونا شروع کیا۔
خدا کے واسطے بتاؤ آخر کیا بات کیا ہے؟ دیکھو، میری طرف دیکھو تو سہی۔
وہ آئی ہنسی، وہ آئی ہونٹوں پر۔ بس اب ہنس تو دو۔ کیا دو دن کی
زندگی میں خواہ مخواہ کا رونا دھونا۔ اُفوہ، یوں نہیں یوں۔ اور اور اور
زور سے میرے سینے سے لپٹ جاؤ.........
لکھنؤ کے کوٹھوں کی سیر میں نے بھی کی ہے۔ ایسا غریب نہیں
ہوں کہ دور ہی دور سے رنڈیوں کو دیکھ کر سسکیاں لیا کروں۔ آیئے حضور
اکبر صاحب! یہ کیا ہے جو مدتوں سے ہماری طرف رُخ ہی نہیں کرتے۔ اِدھر
کوئی نئی چلتی ہوئی غزل کہی ہو تو عنایت فرمایئے۔ گا کر سناؤں۔ لیجئے پان
نوش فرمایئے۔ لے لو اور لو، ذرا دم تو لیجئے۔ نہیں آج تو معاف فرمایئے،
پھر کبھی۔ میں تو آپ کی خادم ہوں......... روپے کی غلام۔ سمجھتی ہے
میرے پاس ٹکے نہیں۔ روپے دیکھ کر راضی ہو گئی۔ کیا سناؤں حضور؟
.... طبلہ کی تھاپ، سارنگی کی آواز، گانا، بجانا۔ پھر تو میں تھا اور وہ تھی

اور ساری رات تھی۔ نیند جسے آئی ہو وہ کافر۔ یہ راتوں کا جاگنا، دوسرے دن
دردِ سر، تھکاوٹ، بدمزگی۔ اماں کی بیماری کے زمانے میں ان کی پلنگ کی
پٹی سے لگا گھنٹوں بیٹھا رہتا تھا۔ اور اُن کی کھانسی۔ کبھی کبھی تو مجھے خود ڈر
معلوم ہونے لگتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہر کھانسی کے ساتھ ان کے سینے میں ایک
گہرا زخم اور پڑ گیا۔ ہر سانس کے ساتھ جیسے زخموں پر سے کسی نے تیز چھری کی
باڑھ چلا دی۔ اور وہ گھر گھراہٹ جیسے کسی پرانے کھنڈر میں لُو چلنے کی آواز
ہوتی ہے۔ ہولناک۔ مجھے اپنی ماں سے ڈر معلوم ہونے لگتا۔ اس ہڈی چمڑے
کے ڈھانچے میں میری ماں کہاں! میں ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتا، دھیرے
سے دباتا، ان کی آدھی کھلی آدھی بند آنکھیں میری طرف مڑتیں، ان کی نظر
مجھ پر ہوتی۔ اس وقت اس شکستہ، پامال، مردہ جسم بھر میں بس آنکھیں زندہ
ہوتیں۔ ان کے ہونٹھ ہلتے۔ اماں! اماں! آپ کیا کہنا چاہتی ہیں، جی!
میں اپنا کان اُن کے لبوں کے پاس لے جاتا۔ وہ اپنا ہاتھ اُٹھا کر میرے سر
پر رکھتیں۔ میرے بالوں میں ان کی اُنگلیاں معلوم ہوتا تھا پھنسی جاتی ہیں اور
وہ چھڑانا نہیں چاہتیں: بہت دیر ہو گئی، جاؤ تم سو رہو......... اماں

یونہی پلنگ پر لیٹی ہیں۔ ایک مہینہ، دو مہینہ، تین مہینہ، ایک سال، دو سال، سو سال، ہزار سال۔ موت کا فرشتہ آیا۔ بدتمیز، بیہودہ کہیں کا! چل نکل یہاں سے بھاگ، ابھی بھاگ، ورنہ تیری دُم کاٹ لونگا، ڈانٹ پڑیگی پھر بڑے میاں کی! ہنستا ہے؟ کیوں کھڑا ہے سامنے دانت نکالے، تیرے فرشتے کی ایسی تیسی۔ تیرے .... فرشتے .... کی

....

ساری دُنیا کی ایسی تیسی، میاں اکبر تمھاری ایسی تیسی۔ ذرا آپ کی قطع ملاحظہ فرمائیے۔ پھونک دو تو اُڑ جائیں۔ بڑے شاعر غرا بنے ہیں۔ مشاعروں میں تعریف کیا ہو جاتی ہے کہ سمجھتے ہیں .... کیا سمجھتے ہیں بیچارے سمجھینگے کیا! بیوی جان کچھ سمجھنے بھی دیں۔ صبح سے شام تک شکایت، رونا دھونا۔ کپڑا پھٹا ہے۔ بچے کی ٹوپی کھو گئی، نئی خرید کے لے آؤ .... جیسے میری اپنی ٹوپی نئی ہے .... کہاں کھو گئی ٹوپی؟ میں کیا جانوں کہاں کھو گئی۔ اسکے ساتھ کونے کونے میں تھوڑی بھاگتی پھرتی ہوں۔ مجھے کام کرنا ہوتا ہے۔ برتن دھونا، کپڑے سینا۔ سارے گھر کا کام میرے

ذمے ہے۔ مجھے کسی کی طرح شعر کہنے کی فرصت نہیں۔ سُن لو خوب اچھی طرح سے، مجھے کام کرنا ہوتا ہے۔ بھڑ کا چھتہ چھیڑ دیا اب جان بچانی مشکل ہو گئی۔ کیا قینچی کی طرح زبان چلتی ہے۔ ماشاءاللہ، چشم بددور .... اچھی طرح جانتے ہو کہ میرے پاس پہننے کو ایک ٹھکانے کا کپڑا نہیں ہے۔ لڑکا تمھارا الگ ننگا گھومتا ہے، مگر تم ہو کہ معلوم ہوتا ہے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ جیسے کسی غیر کے بیوی بچے ہیں۔ ہائے اللہ میری قسمت پھوٹ گئی .... اب رونا شروع ہونے والا ہے۔ میاں اکبر بہتر یہی ہے کہ تم چپکے سے کھسک جاؤ اس میں شرمانے کی کیا بات ہے۔ تمھاری مردانگی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ خیریت بس اب اسی میں ہے کہ خاموشی کے ساتھ کھسک جاؤ۔ ہجرت کرنے سے ایک رسول کی جان بچی۔ معلوم نہیں ایسے موقع پر رسول بیچارے کیا کرتے تھے، عورتوں نے اُن کے بھی تو ناک میں دم کر رکھا تھا۔ تو پھر میری کیا ہستی ہے۔ اے خدا آخر تو نے عورت کیوں پیدا کی؟ مجھ جیسا غریب، کمزور آدمی تیری اس امانت کا بار اپنے کندھوں پر نہیں اُٹھا سکتا۔ اور قیامت کے دن میں جانتا ہوں کیا ہوگا۔ یہی عورتیں وہاں بھی وہ چیخ پکار مچائیں گی، وہ

وہ غرغر کریں گی، وہ آنکھیں ماریں گی کہ اللہ میاں بیچارے خود اپنی سفید داڑھی کھجانے لگیں۔ قیامت کا دن آخر کیسا ہوگا؟ سوا نیزے پر آفتاب، مئی جون کی گرمی اسکے سامنے ہیچ ہوگی.......... گرمی کی تکلیف، توبہ توبہ ارے توبہ! یہ مچھروں کے مارے ناک میں دم نیند حرام ہوگئی۔ پن پن۔ چٹ۔ وہ مارا۔ آخر یہ کمبخت ٹھیک کان کے پاس آکے کیوں بھنبھناتے ہیں۔ خدا کرے قیامت کے دن مچھر نہوں۔ مگر کیا ٹھیک۔ کچھ ٹھیک نہیں۔ آخر مچھر اور کھٹمل اس دنیا ہی میں خدا نے کس مصلحت سے پیدا کئے؟ معلوم نہیں پیمبروں کو کھٹمل اور مچھر کاٹتے ہیں یا نہیں۔ کچھ ٹھیک نہیں، کچھ ٹھیک نہیں.......... آپ کا نام کیا ہے؟ میرا کیا نام ہے۔ کچھ ٹھیک نہیں۔ واہ واہ! مصلحتِ خداوندی۔ خداوندی اور رنڈی اور بھنڈی۔ غلط! بھنڈی ہے۔ بھنڈی تھوڑی ہے۔ میاں اکبر! اتنا بھی اپنی حد سے نہ باہر نکل چلے۔ اور کیا ہے؟ بھر رجز میں ڈال کے بجر رل چلے، بجر رل چلے، خوب! وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے۔ انگور کھٹے! آپ کو کھانا پسند ہے؟ پسند، پسند کیا ہوتا ہے؟ چیز ہاتھ بھی تو لگے۔ مجھے

گھوڑا گاڑی پسند ہے مگر قریب پہونچا نہیں کہ وہ دولتی پڑتی ہے کہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنا پڑتا ہے۔ اور تمھے کیا پسند ہے؟ میری جان! مگر تم تو میری جان سے زیادہ عزیز ہو.......... چلو ہٹو! بس رہنے بھی دو، تمھاری میٹھی میٹھی باتوں کا مزہ میں خوب چکھ چکی ہوں.......... کیوں کیا ہوا کیسا؟ .... ہوا کیا؟ مجھ سے یہ بے غیرتی نہیں سہی جاتی۔ تم جانتے ہو کہ دن بھر لونڈی کی طرح سے میں کام کرتی ہوں، بلکہ لونڈی سے بھی بدتر! جب سے میں اس گھر میں آئی ہوں کسی خدمتگارن کو ایک مہینہ سے زیادہ ٹکتے نہ دیکھا۔ مجھے سال بھر سے زیادہ ہوگئے اور کبھی جو ذرا دم لینے کی فرصت ملی ہو۔ اکبر کی دلھن یہ کرو، اکبر کی دلھن وہ کرو.......... ارے ارے کیا ہوا کیا، تم نے تو پھر رونا شروع کیا.......... میں تمھارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں، مجھے یہاں سے کہیں اور لے جاکے رکھو.......... میں شریف زادی ہوں.......... سب کچھ تو سہہ لیا اب مجھ سے گالی نہ برداشت ہوگی۔ گالی! گالی! معلوم نہیں کیا گالی دی۔ میری بیوی پر گالیاں پڑنے لگیں یا اللہ! یا اللہ! اس بیگم کمبخت کا گلا اور میرا ہاتھ۔ اس کی آنکھیں نکل پڑیں،

زبان باہر نکلنے لگی۔ خس کم جہاں پاک .... خدا کیلئے مجھے چھوڑ دو!
قصور ہوا، معاف کرو، اکبر، میں نے تمہارے ساتھ احسان بھی کئے ہیں
.... احسان تو ضرور کئے ہیں۔ احسانوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مگر
اب تمہارا وقت آگیا۔ کیا سمجھ کے میری بیوی کو گالیاں دی تھیں؟ بس
ختم! آخری دعا مانگ لو! گلا گھونٹنے سے سر کا مُنہ بہت بُرا ہے۔ بالوں کو
پکڑ کر کتنا ہوا سر اُٹھاتا؛ زبان ایک طرف کو نکلی پڑ رہی ہے۔ خون ٹپک
رہا ہے۔ آنکھیں گھور رہی ہیں .... یا اللہ آخر مجھے کیا ہو گیا؟ خون
کا سمندر! میں خون کے سمندر میں ڈوبا جا رہا ہوں۔ چاروں طرف سے
لال لال گولے میری طرف بڑھتے چلے آرہے ہیں۔ وہ آیا! وہ آیا!
ایک، دو، تین! سب میرے سر پر آکر پھٹینگے .... کہیں
یہ دوزخ تو نہیں؟ مگر یہ تو گولے ہیں، آگ کے شعلے نہیں .... میرے
تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میرے رونگٹے جل رہے ہیں۔ دوڑو!
ارے دوڑو! خدا کے لیے دوڑو! میری مدد کرو، میں جلا جا رہا ہوں۔
میرے سر کے بال جلنے لگے۔ پانی! پانی! کوئی سُنتا کیوں نہیں؟

خدا کے واسطے میرے سر پر پانی ڈالو! کیا؟ ان جلتے ہوئے انگاروں
پر سے مجھے ننگے پیر چلنا پڑے گا؟ کیا؟ میری آنکھوں میں دہکتے ہوئے
لوہے کی سلائیں ڈالی جائیں گی؟ کیا؟ مجھے کھولتا ہوا پانی پینے کو ملے
گا؟ کیا کیا کیا؟ مجھے پیپ کھانا پڑیگی؟ یہ شعلے میری طرف کیوں
بڑھتے چلے آرہے ہیں؟ یہ شعلے ہیں یا نیزے ہیں؟ آگ کے نیزے!
زخم کی بھی تکلیف اور جلنے کی بھی۔ یہ کس کے چیخنے کی آواز آئی؟ میں تو
سُن چکا ہوں اس آواز کو۔ اُو اُو اُو .... اُو و و و .... آواز
دور ہوتی جاتی ہے۔ میرے لڑکے نے آخر کیا قصور کیا ہے؟ میرے
لڑکے کو کس جرم کی سزا مل رہی ہے؟ میرا لڑکا تو ابھی چار برس کا ہے۔
اسے تو معاف کر دینا چاہئے۔ میں گنہگار ہوں! میں خطاوار ہوں!
یہ کون آرہا ہے میرے سامنے سے؟ ارے معاذ اللہ! سانپ چمٹے
ہوئے ہیں اسکی گردن سے۔ اس کے پستان کو کاٹ رہے ہیں ......
...... اے حضور! آداب عرض ہے! اے حضور بھول گئے ہم غریبوں
کو؟ میں ہوں مُنّی جان! کوئی ٹھمری، کوئی دادرا، کوئی غزل۔

اے ہے آپ تو جیسے ڈرے جاتے ہیں حضور! یہ سانپ آپ سے کچھ نہیں بولیں گے۔ ان کا بھی عجب لطیفہ ہے۔ میں جب یہاں داخل ہوئی تو داروغہ صاحب نے کہا، بی مُنّی جان! سرکار کا حکم ہے پانچ بچھو تمھاری خدمت کے لیے حاضر کیے جائیں۔ میں حضور سہم گئی۔ بچپن سے مجھے بچھوؤں سے نفرت تھی۔ میں نے حضور بہت ہاتھ پیر جوڑے، مگر داروغہ صاحب نے کہا کہ سرکار کے حکم کی تعمیل ان پر فرض ہے۔ تب میں نے کہا کہ اچھا آپ مجھے سرکار کے دربار میں پہونچا دیں، میں خود اُن سے عرضداشت کروں گی۔ داروغہ صاحب بیچارے بھلے آدمی تھے، مجھے اپنے پاس بُلا کے بٹھایا، میرے گالوں پر ہاتھ پھیر کر، آخر کار راضی ہو گئے۔ پہلے تو مجھے کئی گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ داروغہ صاحب نے کہا کہ اس وقت سرکار پیروں کی کونسل کر رہے ہیں، جب اس سے فرصت ہو گی تب میری پیشی ہو گی۔ میں نے جو یہ سُنا تو کوشش کی کہ جھانک کر اپنے پیر صاحب کا جلوہ دیکھ لوں، مگر دروازے کے دربان، موئے مُشٹنڈے دیو، مجھے دھکا دے کر الگ کر دیا۔ خیر حضور، آخر کار میری باری آئی۔ میرا دل دھڑ دھڑ کر رہا

تھا کہ دیکھوں کیا ہوتا ہے۔ سرکار کے دربار میں داخل ہوتے ساتھ ہی میں گھٹنوں کے بل گر پڑی۔ میری اپنی زبان سے تو کچھ بولا نہ جاتا تھا، داروغہ صاحب نے میرا احوال بیان کیا۔ اتنے میں حکم ہوا کھڑی ہو۔ میں حضور کھڑی ہو گئی۔ تو سرکار خود اُٹھ کے میرے پاس تشریف لائے۔ بڑی سی سفید داڑھی، گورا چٹا رنگ، اور میری طرف مسکرا کے دیکھا۔ پھر میرا ہاتھ پکڑ کر ایک بغل کے کمرے میں لے گئے۔ میری حضور سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا کہ آخر ماجرا کیا ہے....

......مگر حضور دیکھنے ہی میں بڈھے معلوم ہوتے ہیں، ایسے مرد دنیا میں تو میں نے دیکھے نہیں، اور آپ کی دعا سے حضور میرے یہاں بڑے بڑے رئیس آتے تھے! خیر تو حضور بعد میں سرکار نے فرمایا کہ سزا تو مجھے ضرور ملے گی، کیونکہ اُن کا انصاف تو سب کے ساتھ برابر ہے، مگر بجائے بچھو کے مجھے دو ایسے سانپ ملے جو بس میرے پستان چاٹا کرتے ہیں۔ سچ پوچھیے حضور تو اس میں تکلیف کچھ نہیں اور مزا ہی ہے .... مگر آپ تو مجھے ڈرے جاتے ہیں۔

اکبر صاحب! اے حضور اکبر صاحب......... کوئی ٹھمری، کوئی دادرا، کوئی غزل.........

یااللہ مجھے جہنم کی آگ سے بچا! تو ارحم الرّاحمین ہے۔ میں تیرا ایک ناچیز گنہگار بندہ تیرے سامنے دست بدعا ہوں .... مگر کچھ بھی ہو ذلت مجھ سے برداشت نہ ہوگی۔ میری بیوی پر گالیاں پڑنے لگیں۔ مگر میں کروں تو کیا کروں؟ بھوکا مروں؟ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ اُس پر ایک کھوپڑی، کھٹ کھٹ کرتی سڑک پر چلی جا رہی ہے۔ اکبر صاحب! آپ کے جسم کا گوشت کیا ہوا؟ آپ کا چمڑا کدھر گیا؟ جی میں بھوکا مر رہا ہوں، گوشت اپنا میں نے گدھوں کو کھلا دیا، چمڑے کے طبلے بنوا کر بی مُنّی جان کو تحفہ دے دیے۔ کہیے کیا خوب سوجھی! آپ کو رشک آتا ہو تو بسم اللہ میری پیروی کیجئے۔ میں کسی کی پیروی نہیں کرتا! میں آزاد ہوں ہوا کی طرح سے! آزادی کی آج کل اچھی ہوا چلی ہے۔ پیٹ میں آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں اور آپ ہیں کہ آزادی کے چکر میں ہیں۔ موت یا آزادی! نہ مجھے موت پسند نہ آزادی۔ کوئی میرا پیٹ بھر دے۔

ٹِن، ٹِن ٹِن۔ جَسٹ، ہت ترے مچھر کی........

ٹُن ٹُن ٹُن........ ٹُن ٹُن........

جنت کی بشارت

لکھنؤ اس زوال کی حالت میں بھی علوم اسلامیہ کا مرکز ہے۔ متعدد عربی مدارس آج کل کے پُرآشوب زمانے میں شمع ہدایت روشن کئے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کے ہر گوشہ سے حرارت ایمانی رکھنے والے قلوب یہاں آ کر تحصیل علم دین کرتے ہیں اور اسلام کی عظمت قائم رکھنے میں معین ہوتے ہیں۔ بد قسمتی سے وہ دو فرقے جن کے مدارس لکھنؤ میں ہیں ایک دوسرے کو جہنمی سمجھتے ہیں۔ مگر اگر ہم اپنی آنکھوں سے اس فرقہ بندی کی عینک اُتار دیں اور ٹھنڈے دل سے ان دونوں گروہ کے اساتذہ اور طلبا پر نظر ڈالیں تو ہم ان سب کے چہروں پر اُس ایمانی نور کی جھلک پائیں گے جس سے اُن کے دل و دماغ منور ہیں۔ ان کے لمبے کرتے اور قبائیں، ان کی کفش اور سلیپر، ان کی دو پلّی ٹوپیاں، ان کا گھٹا ہوا گول سر اور ان کی متبرک داڑھیاں جن کے ایک ایک بال کو حوریں

اپنی آنکھوں سے ملیں گی، اِن سب سے ان کا تقدس اور زہد ٹپکتا ہے۔ مولوی محمد داؤد صاحب برسوں سے ایک مدرسہ میں درس دیتے تھے اور اپنی نیک نامی کیلئے مشہور تھے۔ عبادت گزاری کا یہ عالم تھا کہ ماہِ مبارکِ رمضان میں رات کی رات، تلاوت و نماز خوانی میں گزر جاتی تھی اور انھیں خبر تک نہ ہوتی۔ دوسرے دن جب دورانِ درس میں نیند کا غلبہ ہوتا تھا تو طالبعلم سمجھتے تھے کہ مولانا پر کیفِ روحانی طاری ہے اور خاموشی سے اُٹھ کر چلے جاتے۔

رمضان کا مبارک مہینہ ہر مسلمان کیلئے رحمتِ الٰہی ہے۔ علی الخصوص جب رمضان مئی اور جون کے لمبے دن اور تپتی ہوئی دھوپ کے ساتھ پڑے۔ ظاہر ہے کہ انسان جس قدر زیادہ تکلیف برداشت کرتا ہے اسی قدر زیادہ ثواب کا مستحق ہوتا ہے۔ ان شدید گرمی کے دنوں میں اللہ کا ہر نیک بندہ مثل ایک بپھرے ہوئے شیر ہوتا ہے جو راہ خدا میں جہاد کرتا ہو۔ اس کا خشک چہرہ اور اس کی دھنسی ہوئی آنکھیں پکار پکار کر کہتی ہیں کہ: "اے وہ گروہ جو ایمان نہیں لاتے اور اے وہ بدنصیبو

جن کے ایمان ڈگمگا رہے ہیں، دیکھو! ہماری صورت دیکھو! اور شرمندہ ہو۔ تمھارے دلوں پر، تمھاری سماعت پر اور تمھاری بصارت پر اللہ پاک نے مہر لگا دی ہے، مگر وہ جن کے دل خوفِ خدا سے تھرا رہے ہیں، اس طرح اس کی فرماں برداری کرتے ہیں"۔

یوں تو ماہِ مبارک کا ہر دن اور ہر رات عبادت کیلئے ہے مگر سب سے زیادہ فضیلت شبِ قدر کی ہے۔ اس رات کو بارگاہ خداوندی کے دروازے اجابتِ دعا کیلئے کھول دیے جاتے ہیں، گناہ گاروں کی توبہ قبول کر لی جاتی ہے اور مومنین بے حد و حساب ثواب لوٹتے ہیں۔ خوش نصیب ہیں وہ بندے جو اس شبِ مسعود کو نماز خوانی اور تلاوتِ قرآن مجید میں بسر کرتے ہیں۔ مولوی داؤد صاحب کبھی ایسے اچھے موقعوں پر کوتاہی نہ کرتے تھے۔ انسان ہر ہر لمحہ اور ساعت میں نہ معلوم کتنے گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے۔ اچھے بُرے ہزاروں خیال دماغ سے گزرتے ہیں۔ قیامت کے ہولناک دن جب ہر شخص کے گناہ اور ثواب تولے جائیں گے اور رتّی رتّی کا حساب دینا ہوگا تو کیا معلوم کیا نتیجہ ہو۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ جتنا

زیادہ ثواب ممکن ہو حاصل کر لیا جائے۔ مولوی داؤد صاحب کو جب لوگ منع کرتے تھے کہ اس قدر زیادہ ریاضت نہ کیا کریں۔ تو وہ ہمیشہ یہی جواب دیتے۔

مولانا کا سن کوئی پچاس سال کا ہوگا، گو کہ پستہ قد تھے مگر توانا۔ گندمی رنگ، گھنی داڑھی، بال کھچڑی تھے۔ مولانا کی شادی اُنیس یا بیس برس کے سن میں ہوگئی تھی۔ آٹھویں بچّے کی ولادت کے وقت انکی پہلی بیوی کا انتقال ہوگیا۔ دو سال بعد اُنچاس برس کے سن میں مولانا نے دوسرا نکاح کیا۔ مگر ان نئی ممدوحہ کی وجہ سے مولانا کی جان ضیق میں رہتی۔ ان کے اور مولوی داؤد صاحب کے سن میں قریب تیس برس کا فرق تھا۔ گو کہ مولانا انھیں یقین دلایا کرتے تھے کہ ان کی داڑھی کے چند بال بلغم کی وجہ سے سفید ہو گئے ہیں، لیکن ان کی جوان بیوی فوراً دوسرے ثبوت پیش کرتیں اور مولانا کو چپ ہو جانا پڑتا۔

ایک سال کے شدید انتظار کے بعد شب قدر پھر آئی۔ افطار کے بعد مولانا گھنٹے آدھ گھنٹے لیٹے، اسکے بعد غسل کر کے مسجد میں نماز

و دعا خوانی کیلئے فوراً روانہ ہوگئے۔ مسجد میں مسلمانوں کا ہجوم تھا۔ اللہ کے عقیدتمند اور نیک بندے، تہمتیں باندھے، لمبی لمبی ڈکاریں لیتے ہوئے مولانا داؤد صاحب سے مصافحہ کرنے کیلئے لپکے۔ مولانا کے چہرے سے نور ٹپک رہا تھا، اور اُن کا عصا گویا اُن کے ایمان کی راستی کا شاہد بن کر سارے مجمع کو مرعوب کر رہا تھا۔ عشا کے بعد ڈیڑھ دو بجے رات تک اکتساب ثواب کا ایک لگاتار سلسلہ رہا، اسکے بعد سحر گہی کی حاضر لذت سے جسم نے نمو پائی اور مولانا گھر واپس چلے۔ جماہی پر جماہی چلی آتی تھی، شیرمال، پلاؤ اور کھیر سے بھرا ہوا معدہ آرام ڈھونڈھ رہا تھا۔ خدا خدا کر کے مولانا گھر واپس پہونچے، روح اور جسم کے درمیان سخت جنگ جاری تھی۔ لیلۃ القدر کے دو تین گھنٹے ابھی باقی تھے جو عبادت میں بسر کئے جا سکتے تھے۔ مگر جسم کو بھی سکون اور نیند کی بے انتہا خواہش تھی۔ آخر کار اس پرانے زاہد نے روحانیت کا دامن تھام لیا اور آنکھیں مل کر نیند بھگانے کی کوشش کی۔

گھر میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ لالٹین بجھی پڑی تھی۔ مولانا نے

دیاسلائی اِدھر اُدھر ٹٹولی مگر وہ نہ ملنا تھی نہ ملی۔ صحن کے ایک کونے میں انکی بیوی کا پلنگ تھا، مولانا دبے قدم، ڈرتے ڈرتے، اُدھر بڑھے اور آہستہ سے بیوی کا شانہ ہلایا۔ گرمیوں کی تاروں بھری رات، اور پچھلے پہر کی خنکی میں مولوی صاحب کی جوان بیوی گہری نیند سو رہی تھیں۔ آخرکار اُنھوں نے کروٹ بدلی، اور آدھے جاگتے، آدھے سوتے ہوئے، دھیمی آواز سے پوچھا: "اے کیا ہے؟"

مولانا اس نرم آواز کے سُننے کے عادی نہ تھے ہمت کر کے ایک لفظ بولے، "دیاسلائی!" مولوی صاحب کی بیوی پر ابھی تک نیند غالب تھی مگر اس نیم بیداری کے عالم میں، رات کی تاریکی، ستاروں کی جگمگاہٹ، اور ہوا کی خنکی نے شباب پر اپنا طلسم کر دیا تھا۔ یکبارگی اُنھوں نے مولانا کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور اُن کے گلے میں دونوں باہیں ڈالکر، اپنے گال کو اُن کے منہ پر رکھ کر، لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے کہا: "آؤ لیٹو۔"

یک لمحہ کیلئے مولانا کا بھی دل بھڑک گیا۔ مگر دوسرے لمحہ میں

انھیں حوا کی آرزو، آدم کا پہلا گناہ، زلیخا کا عشق، یوسف کی چاک دامانی، غرض عورت کے گناہوں کی پوری فہرست یاد آگئی اور اپنے پر قابو ہو گیا۔ چاہے یہ سن کا تقاضا ہو، یا خوف خدا، یا روحانیت کے سبب سے ہو، بہرحال مولانا فوراً اپنی بیوی کے ہاتھ سے نکل کر اُٹھ کھڑے ہوئے، اور پتلی آواز سے پھر پوچھا: "دیاسلائی کہاں ہے؟"

ایک منٹ میں عورت کی نیند اور اُس کی بیساختہ خواہش کی اُمنگ، دونوں غائب ہو کر طنز آمیز غصہ سے بدل گئیں۔ مولانا کی بیوی پلنگ پر اُٹھ بیٹھیں، اور زہر سے بجھی ہوئی زبان سے ایک ایک لفظ تول تول کر کہا: "بڑھا موا! آٹھ بچوں کا باپ! بڑا نمازی بنا ہے! رات کی نیند حرام کر دی۔ دیاسلائی، دیاسلائی! طاق پر پڑی ہوگی۔"

ایک مُسن مرد کا دل دُکھانے کیلئے اِس سے زیادہ تکلیف دہ کچھ نہیں کہ اُس کی جوان بیوی اُسے بڈھا کہے۔ مولانا کانپ گئے مگر کچھ بولے نہیں اُنھوں نے لالٹین جلا کر ایک تخت پر جانماز بچھائی اور قرآن خوانی میں مشغول ہو گئے مولانا کی نیند تو اُڑ گئی تھی مگر تقریباً آدھے گھنٹہ کے بعد بھرے ہوئے معدے کے

بخارات نے جسم کو چور کرکے آنکھوں کو دبانا شروع کیا۔ سورۂ رحمٰن کی فصاحت اور مولانا کی دلآویز قرأت نے لوری کا کام کیا۔ تین چار مرتبہ اونگھ کر مولانا جانماز ہی پر "فَبِاَیِّ ۔ اٰیٔ" کہتے کہتے سوگئے۔

پہلے تو ان پر نیند کی گم شدگی طاری رہی، اسکے بعد انھوں نے یکایک محسوس کیا کہ وہ اکیلے، تن تنہا، ایک تاریک میدان میں کھڑے ہوئے ہیں اور خوف سے کانپ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ اندھیرا روشنی سے بدلنے لگا اور کسی نے اِن کے پہلو سے کہا: "سجدہ کر! تو بارگاہ باری تعالیٰ میں ہے۔" کہنے کی دیر تھی کہ مولوی سجدے میں گر پڑا اور ایک دل دہلا دینے والی آواز، بادل کی گرج کی طرح، چاروں طرف گونجتی ہوئی مولوی کے کان تک آئی: "میرے بندے ہم تجھ سے خوش ہیں! تو ہماری اطاعت میں تمام زندگی اس قدر محو رہا کہ کبھی تو نے اپنی عقل اور اپنے خیال کو جنبش تک نہ دی جو دونوں شیطانی طاقتیں ہیں اور کفر و الحاد کی جڑ ہیں! انسانی سمجھ ایمان و اعتقاد کی دشمن ہے۔ تو اس راز کو خوب سمجھا اور تو نے کبھی نورِ ایمان کو عقل کے زنگ سے تاریک نہ ہونے دیا۔ تیرا انعام جنت ابدی ہے جس میں

تیری ہر خواہش پوری کی جائے گی۔" آواز یہ کہہ کر خاموش ہوگئی۔

تھوڑی مدت تک تو مولوی پر رعبِ خداوندی اس قدر غالب رہا کہ سجدے سے سر اُٹھانے کی ہمت نہ ہوئی۔ کچھ دیر بعد جب دل کی دھڑکن کم ہوئی تو اُنھوں نے لیٹے لیٹے کن انکھیوں سے اپنے داہنے، بائیں نظر ڈالی۔ اِن آنکھوں نے کچھ اور ہی منظر دیکھا۔ سنسان میدان ایک عظیم الشان گول کمرے سے بدل گیا تھا۔ اس کمرے کی دیواریں جواہرات کی تھیں، جن پر عجیب و غریب نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ سُرخ، سبز، زرد، ہرے اور رو پہلے، جگمگاتے ہوئے پھول اور پھل معلوم ہوتا تھا در و دیوار سے ٹپکے پڑتے ہیں۔ روشنی دیواروں سے چھن چھن کر آرہی تھی، لیکن ایسی روشنی جس سے آنکھوں کو ٹھنڈک پہونچے! مولانا اُٹھ بیٹھے اور چاروں طرف نظر دوڑائی۔

عجب! عجب! ہر چہار طرف کمرے کی دیوار پر کوئی ساٹھ یا ستر قدِ آدم کھڑکیاں تھیں اور ہر کھڑکی کے سامنے ایک چھوٹا سا دریچہ۔ ہر ایک دریچہ پر ایک حور کھڑی ہوئی تھی۔ مولانا جس طرف نظر پھیرتے حوریں

اُن کی طرف دیکھ کر مسکراتیں اور دلآویز اشارے کرتیں۔ مگر مولانا جھیپ کر آنکھیں جھکا لیتے۔ دنیا کا مہذب زاہد اس وجہ سے شرمندہ تھا کہ یہ سب کی سب حوریں سر سے پیر تک برہنہ تھیں۔ دفعتہً مولانا نے اپنے جسم پر جو نظر ڈالی تو وہ خود بھی اسی نورانی جامے میں تھے۔ گھبرا کر انھوں نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی ہنس تو نہیں رہا ہے، مگر سوا اِن حوروں کے اور کوئی بھی نظر نہ آیا۔ دُنیا کی شرم گو کہ بالکل غائب نہیں ہوئی تھی، لیکن اسکے وجود کی سب سے بڑی وجہ یعنی اغیار کا طنز و تمسخر جنت میں کہیں نام کو بھی نہ تھا۔ مولانا کی گھبراہٹ کم ہوئی۔ اُن کی رگوں میں جوانی کا خوں از سرِ نو دوڑ رہا تھا۔ وہ جوانی جس کا زوال نہیں!

مولانا نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور مسکراتے ہوئے ایک کھڑکی کی طرف بڑھے۔ حور آگے بڑھی اور اُنھوں نے اُس پر سر سے پیر تک نظر ڈالی۔ اُسکے جسم کا دمکتا ہوا چمپئی رنگ، اُسکی کٹیلی آنکھیں، اُس کا دل فریب تبسم، اِس جنتِ نگاہ سے مولانا کی آنکھیں ہٹتی ہی نہ تھیں لیکن انسان ایک اچھی چیز سے بھلا کب سیر ہوتا ہے۔ مولانا کے قدم اُٹھے اور

وہ دوسرے در کی طرف بڑھے۔ اسی طرح وہ ہر در پر جا کر تھوڑی دیر رُکتے، ان بہشتی ہستیوں کے ہر ہر عضوِ بدن کو غور سے دیکھتے اور مسکرا کر دُرود پڑھتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔ کسی کے گھونگھر والے بالوں کی سیاہی انھیں سب سے زیادہ پسند آتی، کسی کے گلابی گال، کسی کے عنابی ہونٹ، کسی کی متناسب ٹانگیں، کسی کی پتلی انگلیاں، کسی کی خمار آلود آنکھیں، کسی کی نوکیلی چھاتیاں، کسی کی نازک کمر، کسی کا نرم پیٹ۔

آخر کار ایک حور کی پیاری ادا نے مولانا کا دل موہ لیا۔ وہ فوراً اُچک کر اُسکے حجرے میں داخل ہوے اور اُسے بیساختہ اپنے سینے سے لگا لیا۔ مگر ابھی لب سے لب ملے ہی تھے کہ پیچھے سے قہقہے کی آواز آئی۔ اس بے موقعہ ہنسی پر مولانا کے غصہ کی کوئی اِنتہا نہ رہی۔ ان کی آنکھ کھل گئی۔ سُورج نکل آیا تھا۔ مولانا جانماز پر پیٹ کے بل پڑے ہوئے قرآن کریم کو سینے سے لگائے تھے۔ ان کی بیوی پہلو میں کھڑی ہنس رہی تھیں۔

گرمیوں کی ایک رات

منشی برکت علی عشاء کی نماز پڑھ کر چہل قدمی کرتے ہوئے امین آباد پارک تک چلے آئے۔ گرمیوں کی رات، ہوا بند تھی۔ شربت کی چھوٹی چھوٹی دوکانوں کے پاس لوگ کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ لونڈے چیخ چیخ کر اخبار بیچ رہے تھے۔ بیلے کے ہار والے ہر بھلے مانس کے پیچھے ہار لے کر لپکتے۔ چوراہے پر تانگہ اور یکہ والوں کی لگاتار پکار جاری تھی۔

"چوک! ایک سواری چوک! میاں چوک پہنچا دوں!"

"اے حضور کوئی تانگہ واگہ چاہیے!"

"ہار بیلے کے! گجرے موتیے کے!"

"کیا ملائی کی برف ہے!"

منشی جی نے ایک ہار خریدا، شربت پیا اور پان کھا کر پارک کے

اندر داخل ہوئے۔ بنچوں پر بالکل جگہ نہ تھی۔ لوگ نیچے گھاس پر لیٹے ہوئے تھے۔ چند بے سرے گانے کے شوقین اِدھر اُدھر شور مچا رہے تھے۔ بعض آدمی چپ بیٹھے، دھوتیاں کھسکا کر بڑے اطمینان سے اپنی ٹانگیں اور رانیں کھجانے میں مشغول تھے۔ اسی دوران میں وہ مچھروں پر بھی جھپٹ جھپٹ کر حملے کرتے جاتے تھے۔ منشی جی چونکہ پائجامہ پوش آدمی تھے انھیں اس بدتمیزی پر بہت غصہ آیا۔ اپنے جی میں انھوں نے کہا کہ اِن کم بختوں کو کبھی تمیز نہ آئے گی، اتنے میں ایک بنچ پر سے کسی نے انھیں پکارا۔

"منشی برکت علی!"

منشی جی مڑے۔

"اخّاہ لالہ جی آپ ہیں۔ کہئے مزاج تو اچھے ہیں!"

منشی جی جس دفتر میں نوکر تھے لالہ جی اُس کے ہیڈ کلرک تھے۔ منشی جی ان کے ماتحت تھے۔ لالہ جی نے جوتے اُتار دیے تھے، اور بنچ کے بیچوں بیچ میں پیر اٹھا کر اپنا بھاری بھرکم جسم لئے بیٹھے تھے۔ وہ اپنی توند پر

نرمی سے ہاتھ پھیرتے جاتے اور اپنے ساتھیوں سے جو بنچ کے دونوں کونوں پر ادب سے بیٹھے ہوئے تھے بیچ بیچ کر باتیں کر رہے تھے۔ منشی جی کو جاتے دیکھ کر انھوں نے انھیں بھی پکار لیا۔ منشی جی لالہ صاحب کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔

لالہ جی ہنس کے بولے: "کہو منشی برکت علی یہ ہار وار خریدے ہیں، کیا ارادے کیا ہیں!" اور یہ کہکر زور سے قہقہہ لگا کر اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف داد طلب کرنے کو دیکھا۔ انھوں نے بھی لالہ جی کا منشا دیکھکر ہنسنا شروع کیا۔

منشی جی بھی روکھی پھیکی ہنسی ہنسے: "جی ارادے کیا ہیں ہم تو آپ جانئے غریب آدمی ٹھہرے۔ گرمی کے مارے دم نہیں لیا جاتا۔ راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔ یہ ہار لے لیا شاید دو گھڑی آنکھ لگ جائے۔"

لالہ جی نے اپنے گنجے سر پہ ہاتھ پھیرا اور ہنسے: "شوقین آدمی ہو منشی، کیوں نہ ہو!" اور یہ کہہ کر پھر اپنے ساتھیوں سے گفتگو میں مشغول ہو گئے۔

منشی جی نے موقعہ غنیمت جان کر کہا "اچھا لالہ جی چلتے ہیں، آداب عرض ہے۔" اور یہ کہہ کر آگے بڑھے۔ دل ہی دل میں کہتے تھے کہ دن بھر کی گھس گھس کے بعد یہ لالہ کمبخت سر پڑا۔ پوچھتا ہے ارادے کیا ہیں! ہم کوئی رئیس تعلقدار ہیں کہیں کے کہ رات کو مجھ کر مجرا سنیں اور کوٹھوں کی سیر کریں جیب میں کبھی چونی سے زیادہ ہو بھی سہی، بیوی، بچے، ساٹھ روپیہ مہینہ اوپر سے آمدنی کا کچھ ٹھیک نہیں، آج نہ جانے کیا تھا جو ایک روپیہ مل گیا۔ یہ دیہاتی اہل معاملہ کمبخت روز بروز چالاک ہوتے جاتے ہیں۔ گھنٹوں کی جھک جھک کے بعد جیب سے ٹکا نکالتے ہیں۔ اور پھر سمجھتے ہیں کہ غلام خرید لیا سیدھے بات نہیں کرتے کمینہ نیچے درجے کے لوگ ان کا سر پھر گیا ہے۔ آفت ہم بیچارے شریف سفید پوشوں کی ہے۔ ایک طرف تو نیچے درجے کے لوگوں کے مزاج نہیں ملتے۔ دوسری طرف بڑے صاحب اور سرکار کی سختی بڑھتی جاتی ہے۔ ابھی دو مہینے کا ذکر ہے، بنارس کے ضلع میں دو محرر بیچارے رشوت ستانی کے جرم میں برخواست کر دیے گئے۔ ہمیشہ یہی ہوتا ہے غریب بیچارہ پستا ہے بڑے افسر کا بہت ہوا تو ایک جگہ سے دوسری

جگہ تبادلہ ہو گیا۔

"منشی جی صاحب!" کسی نے بازو سے پکارا۔ جمن چپراسی کی آواز۔

منشی جی نے کہا! "اخاہ تم ہو جمن!"

مگر منشی جی چلتے رہے، رکے نہیں۔ پارک سے مڑ کر نظیر آباد میں پہنچ گئے۔ جمن ساتھ ساتھ ہو لیا۔ دبلے پتلے، پستہ قد، مخمل کی کشتی نما ٹوپی پہنے، ہار ہاتھ میں لیے آگے آگے منشی جی اور ان سے قدم دو قدم پیچھے صافہ باندھے، چکن پہنے، قوی ہیکل، لمبا چوڑا چپراسی جمن۔

منشی جی نے سوچنا شروع کیا کہ آخر اس وقت جمن کا میرے ساتھ ساتھ چلنے میں کیا مقصد کیا ہے۔

"کہو بھئی جمن، کیا حال ہے۔ ابھی پارک میں ہیڈ کلارک صاحب سے ملاقات ہوئی تھی وہ بھی گرمی کی شکایت کرتے تھے۔"

"اجی منشی جی کیا عرض کروں۔ ایک گرمی صرف تھوڑی ہے جو مارے ڈالتی ہے۔ ساڑھے چار پانچ بجے دفتر سے چھٹی ملی۔ اس کے بعد سیدھے وہاں سے بڑے صاحب کے ہاں گھر پر حاضری دینی پڑی۔ اب جا کر

وہاں سے چھٹکارا ہوا تو گھر جا رہا ہوں۔ آپ جانیئے کہ دس بجے صبح سے رات کے آٹھ بجے تک دوڑ دھوپ رہتی ہے۔ کچہری کے بعد تین دفعہ دوڑ دوڑ کر بازار جانا پڑا۔ برف، ترکاری، پھل سب خرید کے لاؤ اور اوپر سے ڈانٹ الگ پڑتی ہے، آج داموں میں ٹکا زیادہ کیوں ہے اور یہ پھل سڑے کیوں ہیں۔ آج جو آم خرید کے لے گیا تھا وہ بیگم صاحب کی پسند نہیں آئے۔ واپسی کا حکم ہوا۔ میں نے کہا، حضور! اب رات کو بھلا یہ واپس کیسے ہونگے، تو جواب ملا ہم کچھ نہیں جانتے کوڑا تھوڑی خریدنا ہے۔ سو حضور یہ روپیہ کے آم گلے پڑے۔ آم والے کے ہاں گیا تو ایک تو توتو میں میں کرنی پڑی۔ روپیہ کے آم بارہ آنے میں واپس ہوئے چونی کی چوٹ پڑی۔ مہینہ کا ختم، اور گھر میں حضور قسم لے لیجیے جو سوکھی روٹی بھی کھانے کو ہو۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں اور کونسا منہ لے کر جورو کے سامنے جاؤں۔"

منشی جی گھبرائے۔ آخر جمن کا منشا اس ساری داستان کے بیان کرنے سے کیا تھا۔ کون نہیں جانتا کہ غریب تکلیف اٹھاتے ہیں اور بھوکے مرتے ہیں۔ مگر منشی جی کا اس میں کیا قصور؟ ان کی زندگی خود کون بہت

آرام سے کٹتی ہے۔ منشی جی کا ہاتھ بے ارادے اپنی جیب کی طرف گیا۔ وہ روپیہ جو آج اُنھیں اوپر سے ملا تھا صحیح سلامت جیب میں موجود تھا۔

"ٹھیک کہتے ہو میاں جمن، آج کل کے زمانے میں غریبوں کی مرن ہے جسے دیکھو یہی رونا روتا ہے، کچھ گھر میں کھانے کو نہیں۔ سچ پوچھو تو سارے آثار بتاتے ہیں کہ قیامت قریب ہے۔ دُنیا بھر کے چلبلے تو چین سے مزے اڑاتے ہیں اور جو بیچارے اللہ کے نیک بندے ہیں انھیں ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف برداشت کرنی ہوتی ہے۔"

جُمن چپ چاپ منشی جی کی باتیں سُنتا اُن کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ منشی جی یہ سب کہتے تو جاتے تھے مگر ان کی گھبراہٹ بھی بڑھتی جاتی تھی۔ معلوم نہیں ان کی باتوں کا جمن پر کیا اثر ہو رہا تھا۔

"کل جمعہ کی نماز کے بعد مولانا صاحب نے آثارِ قیامت پر وعظ فرمایا۔ میاں جُمن سچ کہتا ہوں، جس جس نے سُنا اُسکی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ بھائی دراصل یہ ہم سب کی سیاہ کاریوں کا نتیجہ ہے۔ خدا کی طرف سے جو کچھ عذاب ہم پر نازل ہو وہ کم ہے۔ کونسی بُرائی ہے جو ہم میں نہیں؟

اس سے کم قصور پر اللہ نے بنی اسرائیل پر جو جو مصیبتیں نازل کیں اُن کا خیال کر کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں مگر وہ تو تم جانتے ہی ہو گے۔"

جُمن بولا: "ہم غریب آدمی منشی جی، بھلا یہ سب علم کی باتیں کیا جانیں۔ قیامت کے بارے میں تو میں نے سُنا ہے مگر حضور آخر یہ بنی اسرائیل بیچارے کون تھے؟"

اِس سوال کو سُن کر منشی جی کو ذرا سکون ہوا۔ خیر غربت اور فاقے سے گزر کر اب قیامت اور بنی اسرائیل تک گفت گو کا سلسلہ پہونچ گیا تھا۔ منشی جی خود کافی طور پر اس قبیلے کی تاریخ سے واقف نہ تھے مگر ان مضمونوں پر گھنٹوں باتیں کر سکتے تھے۔

"ایں! واہ میاں جمن واہ، تم اپنے کو مُسلمان کہتے ہو اور یہ نہیں جانتے کہ بنی اسرائیل کس چڑیا کا نام ہے۔ میاں سارا کلام پاک بنی اسرائیل کے ذکر سے تو بھرا پڑا ہے۔ حضرت موسیٰ کلیم اللہ کا نام بھی تم نے سُنا ہے؟"

"جی کیا فرمایا آپ نے؟ کلیم اللہ؟"

"ارے بھئی حضرت موسیٰ۔ مو...... سا۔"

"موسا...... وہی تو نہیں جن پر بجلی گری تھی ؟"

منشی جی زور سے ٹھٹھا مار کر ہنسے۔ اب انہیں بالکل اطمینان ہو گیا چلتے چلتے وہ قیصر باغ کے چوراہے تک بھی آپہونچے تھے۔ یہاں پر تو ضرور ہی اس بھوکے چپراسی کا ساتھ چھوٹے گا۔ رات کو اطمینان سے جب کوئی کھانا کھا کر، نماز پڑھ کر، دم بھر کی دلبستگی کیلیے چہل قدمی کو نکلے، تو ایک غریب بھوکے انسان کا ساتھ ساتھ ہو جاتا، جس سے پہلے کی واقفیت بھی ہو، کوئی خوشگوار بات نہیں۔ مگر منشی جی آخر کرتے کیا؟ جمن کو کتّے کی طرح دھتکار تو سکتے نہ تھے۔ کیونکہ ایک تو کچہری میں روز کا سامنا، دوسرے وہ نیچے درجے کا آدمی ٹھہرا، کیا ٹھیک، کوئی بدتمیزی کر بیٹھے تو سر بازار خواہ مخواہ کو اپنی بنی بنائی عزّت میں بٹّہ لگے۔ بہتر یہی تھا کہ اب اس چوراہے پر پہنچ کر دوسری راہ لی جائے اور یوں اُس سے چھٹکارا ہو۔

"خیر، بنی اسرائیل اور موسٰی کا ذکر میں تم سے پھر کبھی پوری طرح کروں گا، اس وقت تو ذرا مجھے اِدھر کام سے جانا ہے...... سلام میاں جمن۔"

یہ کہہ کر منشی جی قیصر باغ کے سینما کی طرف بڑھے۔ منشی جی کو یوں تیز قدم

جاتے دیکھکر پہلے تو جمن ایک لمحے کے لیے اپنی جگہ پر کھڑا کا کھڑا رہ گیا، اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ آخر کرے تو کیا کرے۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اُسکی آنکھیں ایک بے معنی طور پر اِدھر اُدھر مڑ رہی تھیں۔ تیز بجلی کی روشنی، فوارہ، سینما کے اشتہار، ہوٹل، دوکانیں، موٹر، تانگے یکے اور سب کے اوپر تاریک آسمان اور جھلملاتے ہوے ستارے۔ غرض خدا کی ساری بستی۔

دوسرے لمحہ میں جمن منشی جی کی طرف لپکا۔ وہ اب کھڑے ہو سینما کے اشتہار دیکھ رہے تھے اور بیحد خوش تھے کہ جمن سے جان چھوٹی۔

جمن نے اُنکے قریب پہنچ کر کہا "منشی جی!"

منشی جی کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ ساری مذہبی گفتگو، ساری قیامت کی باتیں، سب بیکار گئیں۔ منشی جی نے جمن کو کچھ جواب نہیں دیا۔

جمن نے کہا "منشی جی اگر آپ اس وقت مجھے ایک روپیہ قرض دے سکتے تو میں ہمیشہ ...."

منشی جی مڑے "میاں جمن میں جانتا ہوں کہ تم اس وقت تنگی میں ہو

مگر تم تو خود جانتے ہو کہ میرا اپنا کیا حال ہے۔ روپیہ تو روپیہ ایک پیسہ تک میں تمہیں نہیں دے سکتا۔ اگر میرے پاس ہوتا تو بھلا تم سے چھپانا تھوڑا ہی تھا۔ تمہارے کہنے کی بھی ضرورت نہ ہوتی پہلے ہی جو کچھ ہوتا تمہیں دے دیتا۔"

باوجود اسکے جمن نے اصرار شروع کیا "منشی جی قسم لے لیجیے میں ضرور آپ کو تنخواہ ملتے ہی واپس کر دونگا۔ سچ کہتا ہوں حضور اس وقت کوئی میری مدد کرنے والا نہیں......"

منشی جی اس جھک جھک سے بہت گھبراتے تھے۔ انکار چاہے وہ سچا ہی کیوں نہ ہو تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے تو وہ شروع سے چاہتے تھے کہ یہاں تک نوبت ہی نہ آئے۔

اتنے میں سنیما ختم ہوا اور تماشائی اندر سے نکلے۔

"ارے میاں برکت، بھئی تم کہاں!" کسی نے پہلو سے پکارا۔ منشی جی جمن کی طرف سے ادھر مڑے۔ ایک صاحب موٹے تازے، تیس پینتیس برس کے۔ انگرکھا اور دوپلی ٹوپی پہنے، پان کھائے، سگریٹ پیتے ہوئے منشی جی کے سامنے کھڑے تھے۔ منشی جی نے کہا:

"اخاہ تم ہو! برسوں کے بعد ملاقات ہوئی۔ تم نے لکھنؤ تو چھوڑ ہی دیا، مگر بھائی کیا معلوم آتے بھی ہو گے تو ہم غریبوں سے کیوں ملنے لگے!"

یہ منشی جی کے پرانے کالج کے ساتھی تھے۔ روپے، پیسے والے رئیس آدمی وہ بولے:

"خیر یہ سب باتیں تو چھوڑو۔ میں دو دن کیلیے یہاں آیا ہوں۔ ذرا لکھنؤ میں تفریح کیلیے۔ چلو اس وقت میرے ساتھ چلو تمہیں وہ مجرا سنواؤں کہ عمر بھر یاد کرو۔ میری موٹر موجود ہے۔ اب زیادہ مت سوچو، بس چلے چلو۔ سنا ہے تم نے کبھی نور جہاں کا گانا؟ اہاہا! کیا گاتی ہے کیا بتاتی ہے، کیسا ناچتی ہے۔ وہ ادا وہ چھبن، انکی کمر کی لچک، اسکے پاؤں کے گھنگھرو کی جھنکار! میرے مکان پر، کھلے صحن میں، تاروں کی چھاؤں میں۔ محفل ہو گی۔ بھیروی سنکر جلسہ برخواست ہوگا۔ بس اب زیادہ نہ سوچو، چلے ہی چلو۔ کل اتوار ہے...... بیوی! بیگم صاحب کی جوتیوں کا ڈر ہے۔ اگر ایسا ہی عورت کی غلامی کرنا تھی تو شادی کیوں کی۔ چلو بھی میاں! لطف رہے گا۔ روٹھی بیگم کو منانے میں بھی تو مزہ ہے......"

پرانا دوست، موٹر کی سواری، گانا ناچ، جنت نگاہ، فردوس گوش، منشی جی لپک کر موٹر میں سوار ہو لیے۔ جمن کی طرف ان کا خیال بھی نہ گیا۔ جب موٹر چلنے لگی تو اونھوں نے دیکھا کہ وہ وہاں اُسی طرح چپ کھڑا ہے۔

دُلاری

گو کہ بچپن سے وہ اِس گھر میں رہی اور پلی، مگر سولھیں سترھیں برس میں تھی کہ آخر کار لونڈی بھاگ گئی۔ اسکے ماں باپ کا پتہ نہیں تھا، اس کی ساری دنیا یہی گھر تھا اور اسکے گھر والے۔ شیخ ناظم علی صاحب خوش حال آدمی تھے۔ گھرانے میں ماشاراللہ کئی بیٹے اور بیٹیاں بھی تھیں۔ بیگم صاحب بھی بقید حیات تھیں اور زنانہ میں ان کا پورا راج تھا۔ دُلاری خاص اُن کی لونڈی تھی۔ گھر میں اور نوکرانیاں اور مامائیں آتیں، مہینہ دو مہینہ، سال دو سال کام کرتیں اسکے بعد ذرا سی بات پر جھگڑ کر نوکری چھوڑ دیتیں اور چلی جاتیں۔ مگر دلاری کیلیے ہمیشہ ایک ہی ٹھکانا تھا۔ اس سے گھر والے کافی مہربانی سے پیش آتے۔ اونچے درجے کے لوگ ہمیشہ اپنے سے نیچے طبقے والوں کا خیال رکھتے ہیں۔ دُلاری کو کھانے اور کپڑے کی شکایت نہ تھی۔ دوسری نوکرانیاں

کے مقابلے میں اس کی حالت اچھی ہی تھی۔ مگر باوجود اسکے کبھی کبھی جب کسی ماما سے اور اُس سے جھگڑا ہوتا تو وہ یہ طنز ہمیشہ سُنتی: "میں تیری طرح کوئی لونڈی تھوڑی ہوں"۔ اس کا دُلاری کے پاس کوئی جواب نہ ہوتا۔

× × × ×

اس کا بچپن بے فکری میں گزرا۔ اس کا رتبہ گھر کی بی بیوں سے تو کیا نوکرانیوں سے بھی پست تھا۔ وہ پیدا ہی اس درجہ میں ہوئی تھی۔ یہ تو سب خدا کا کیا دھرا ہے، وہی جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے۔ اسکا رونا کیا؟ دلاری کو اپنی پستی کی کوئی شکایت نہ تھی۔ مگر جب اسکی عمر کا وہ زمانہ آیا جب لڑکپن کا ختم اور جوانی کی آمد ہوتی ہے، اور دل کی گہری اور اندھیری بےچینیاں زندگی کو کبھی تلخ اور کبھی میٹھی بناتی ہیں تو وہ اکثر رنجیدہ سی رہنے لگی۔ لیکن یہ ایک اندرونی کیفیت تھی جسکی اُسے نہ تو وجہ معلوم تھی نہ دوا۔ چھوٹی صاحبزادی حسینہ بیگم اور دلاری دونوں قریب قریب ہمسن تھیں اور ساتھ کھیلتیں۔ مگر جوں جوں ان کا سن بڑھتا تھا توں توں دونوں کے درمیاں فاصلہ زیادہ ہوتا جاتا۔ صاحبزادی کیونکہ شریف

تھیں ان کا وقت پڑھنے لکھنے، سینے پرونے، میں صرف ہونے لگا۔ دُلاری کمروں کی خاک صاف کرتی، جھوٹے برتن دھوتی، گھڑوں میں پانی بھرتی۔ وہ خوبصورت تھی، کشادہ چہرہ، لمبے لمبے ہاتھ پیر، بھرا جسم۔ مگر عام طور سے اسکے کپڑے میلے کچیلے ہوتے اور اُسکے بدن سے بو آتی۔ تیوہار کے دنوں البتہ وہ اپنے رکھاؤں کپڑے نکال کر پہنتی اور سنگار کرتی، یا اگر کبھی شاذ و نادر اُسے بیگم صاحبہ یا صاحبزادیوں کے ساتھ کہیں جانا ہوتا تب بھی اُسے صاف کپڑے پہننا ہوتے۔

× × × ×

شب برات تھی۔ دُلاری گڑیا بنی تھی۔ زنانے کے صحن میں آتشبازی چھوٹ رہی تھی۔ سب گھر والے نوکر چاکر کھڑے تماشہ دیکھتے۔ بچّے غل مچا رہے تھے۔ بڑے صاحبزادے کاظم بھی موجود تھے جن کا سن بیس اکیس برس کا تھا۔ یہ اپنی کالج کی تعلیم ختم ہی کرنے والے تھے۔ بیگم صاحب انھیں بہت چاہتی تھیں مگر یہ ہمیشہ گھر والوں سے بیزار رہتے اور انھیں تنگ خیال اور جاہل سمجھتے۔ جب چھٹیوں میں گھر آتے تو ان کو بحث ہی کرتے گزر جاتی۔ یہ اکثر پرانی رسموں کے

خلاف تھے مگر اظہار ناراضی کر کے سب کچھ برداشت کر لیتے۔ اس سے زیادہ کچھ کرنے کیلیے تیار نہیں تھے۔

انھیں پیاس لگی، اور اُنھوں نے اپنی ماں کے کندھے پر سر رکھکر کہا: "امّی جان پیاس لگی ہے۔" بیگم صاحبہ نے محبت بھرے لہجے میں جواب دیا: "بیٹا شربت پیو۔ میں ابھی بنواتی ہوں۔" اور یہ کہہ کر دُلاری کو پکار کر کہا کہ شربت تیار کرے۔

کاظم بولے: "جی نہیں امّی جان۔ اُسے تماشہ دیکھنے دیجیے۔ میں خود اندر جاکر پانی پی لونگا۔" مگر دُلاری حکم ملتے ہی اندر کی طرف چل رہی تھی۔ کاظم بھی پیچھے پیچھے دوڑے۔ دُلاری ایک تنگ اندھیری کوٹھری میں شربت کی بوتل چُن رہی تھی۔ کاظم بھی وہیں پہونچ کر رکے۔

دُلاری نے مڑکر پوچھا: "آپ کیلیے کونسا شربت تیار کردوں؟" مگر اُسے کوئی جواب نہ ملا۔ کاظم نے دُلاری کو آنکھ بھر کر دیکھا، دُلاری کا سارا جسم تھرتھرانے لگا اور اسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اُسنے ایک بوتل اُٹھالی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ کاظم نے بڑھ کر بوتل اسکے ہاتھ سے لے کر

الگ رکھ دی اور اُسے گلے سے لگالیا۔ لڑکی نے آنکھیں بند کرلیں اور اپنے تن من کو اُنکی گود میں دے دیا۔

دو ہستیوں نے، جن کی ذہنی زندگی میں زمین و آسمان کا فرق تھا، یکایک یہ محسوس کیا کہ وہ آرزوؤں کے ساحل پر آگئے۔ در اصل وہ تنکوں کی طرح تاریک طاقتوں کے سمندر میں بہے چلے جارہے تھے۔

× × × × × × ×

ایک سال گزر گیا۔ کاظم کی شادی ٹھہر گئی۔ شادی کے دن آگئے۔ چار پانچ دن میں گھر میں دُلھن آجائے گی۔ گھر میں مہمانوں کا ہجوم ہے۔ ایک جشن ہے۔ کام کی کثرت ہے۔ دُلاری ایک دن رات کو غائب ہوگئی، بہت چھان بین ہوئی، پولیس کو اطلاع دی گئی، مگر کہیں پتہ نہ چلا۔ ایک نوکر پر سب کا شُبہ تھا، لوگ کہتے تھے کہ اُسی کی مدد سے دلاری بھاگی اور وہی اُسے چھپائے ہوئے ہے۔ وہ نوکر نکال دیا گیا۔ درحقیقت دُلاری اُسی کے پاس نکلی مگر اُس نے واپس جانے سے صاف انکار کر دیا۔

تین چار مہینے بعد شیخ ناظم علی صاحب کے ایک بڈھے نوکر نے

دلاری کو شہر کی غریب رنڈیوں کے محلہ میں دیکھا۔ بڈھا بیچارا بچپن سے دلاری کو جانتا تھا۔ وہ اُس کے پاس گیا اور گھنٹوں تک دُلاری کو سمجھایا کہ واپس چلے وہ راضی ہوگئی۔ بڈھا سمجھتا تھا کہ اُسے انعام ملے گا اور یہ لڑکی مصیبت سے نبچے گی۔

دلاری کی واپسی نے سارے گھر میں کھلبلی ڈال دی۔ وہ گردن جھکائے، سر پر تک ایک سفید چادر اُڑھے، پریشان صورت، اندر داخل ہوئی اور سائبان کے کونے میں جاکر زمین پر بیٹھ گئی۔ پہلے تو نوکرانیاں آئیں۔ وہ دور سے کھڑے ہوکر اُسے دیکھتیں اور افسوس کر کے چلی جاتیں۔ اتنے میں ناظم علی صاحب زنانہ میں تشریف لائے۔ انھیں جب معلوم ہوا کہ دُلاری واپس آگئی ہے، تو وہ باہر نکلے، جہاں دلاری بیٹھی تھی۔ وہ کام کاجی آدمی تھے، گھر کے معاملات میں بہت کم حصہ لیتے تھے: انھیں بھلا ان ذرا ذرا سی باتوں کی کہاں فرصت تھی۔ دُلاری کو دُور سے پکار کر کہا "بے وقوف اب ایسی حرکت نہ کرنا!" اور یہ فرما کر اپنے کام پر چلے گئے۔ اسکے بعد چھوٹی صاحبزادی، دبے قدم، اندر سے برآمد ہوئیں

اور دُلاری کے پاس پہونچیں، مگر بہت قریب نہیں، اس وقت وہاں اور کوئی نہ تھا۔ دہ دلاری کے ساتھ کی کھیلی ہوئی تھیں۔ دُلاری کے بھاگنے کا انھیں بہت افسوس تھا۔ شریف، پاکباز، باعصمت حسینہ بیگم کو اس غریب بے چاری پر بہت ترس آ رہا تھا، مگر ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کوئی لڑکی کیسے ایسے گھر کا سہارا چھوڑ کر جہاں اُسکی ساری زندگی بسر ہوئی ہو باہر قدم تک رکھ سکتی ہے۔ اور پھر نتیجہ کیا ہوا؟ عصمت فروشی، غربت، ذلت یہ سچ ہے کہ وہ لونڈی تھی، مگر بھاگنے سے اسکی حالت بہتر کیسے ہوئی؟ دُلاری گردن جھکائے بیٹھی تھی۔ حسینہ بیگم نے خیال کیا کہ وہ اپنے کئے پر پشیمان ہے۔ اس گھر سے بھاگنا، جس میں وہ پلی، احسان فراموشی تھی۔ مگر اسکی اُسے کافی سزا مل گئی۔ خدا بھی گنہ گاروں کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔ گو کہ اسکی آبرو خاک میں مل گئی مگر ایک لونڈی کیلیے یہ اتنی اہم چیز نہیں جتنی ایک شریف زادی کیلیے۔ کسی نوکر سے اسکی شادی کر دیجائیگی۔ سب پھر سے ٹھیک ہو جائے گا۔ اُنھوں نے آہستہ سے نرم لہجے میں کہا: "دُلاری یہ تو نے کیا کیا؟" دُلاری نے گردن اُٹھائی، ڈبڈبائی آنکھوں سے ایک لمحہ کیلیے

اپنے بچپن کی ہمجولی کو دیکھا اور پھر اُسی طرح سے سر جھکا لیا۔

حسینہ بیگم واپس جا رہی تھیں کہ خود بیگم صاحب آ گئیں۔ ان کے چہرہ پر فاتحانہ مُسکراہٹ تھی، وہ دُلاری کے بالکل پاس آ کر کھڑی ہو گئیں۔ دلاری اسی طرح چُپ، گردن جُھکائے بیٹھی رہی۔ بیگم صاحب نے اُسے ڈانٹنا شروع کیا:

"بے حیا! آخر جہاں سے گئی تھی وہیں واپس آئی نہ، گر منہ کالا کر کے۔ سارا زمانہ تجھ پر تھُڑی تھُڑی کرتا ہے۔ بُرے فعل کا یہی انجام ہے......"

گر باوجود اِن سب باتوں کے بیگم صاحب اسکے لوٹ آنے سے خوش تھیں۔ جب سے دُلاری بھاگی تھی گھر کا کام اُتنی اچھی طرح نہیں ہوتا تھا۔

اس لعن طعن کا تماشہ دیکھنے، سب گھر والے بیگم صاحب اور دُلاری کے چاروں طرف جمع ہو گئے تھے۔ ایک نجس، ناچیز ہستی کو اس طرح ذلیل دیکھکر سب اپنی بڑائی اور بہتری محسوس کر رہے تھے۔ مردار خوار گدھ بھلا کب سمجھتے ہیں کہ جس بیکس جسم پر وہ اپنی کثیف ٹھونگیں مارتے ہیں بے جان ہونے کے باوجود بھی اُن کے ایسے زندوں سے بہتر ہے۔

یکایک بغل کے کمرہ سے کاظم اپنی خوبصورت دُلہن کے ساتھ نکلے اور اپنی ماں کی طرف بڑھے۔ اُنھوں نے دلاری پر نظر نہیں ڈالی۔ ان کے چہرے سے غصہ نمایاں تھا۔ اُنھوں نے اپنی والدہ سے دُرشت لہجہ میں کہا: "امّی خدا کیلیے اس بدنصیب کو اکیلی چھوڑ دیجئے۔ وہ کافی سزا پا چکی ہے۔ آپ دیکھتی نہیں کہ اسکی حالت کیا ہو رہی ہے!"

لڑکی اس آواز کے سننے کی تاب نہ لا سکی۔ اسکی نظروں کے سامنے وہ سماں پھر گیا جب وہ اور کاظم راتوں کی تنہائی میں یکجا ہوتے تھے، جب اُسکے کان پیار کے لفظ سننے کے عادی تھے۔ کاظم کی شادی اُسکے سینے میں نشتر کی طرح چبھتی تھی۔ اسی خلش، اسی بیدلی نے اُسے کہاں سے کہاں پہونچا دیا، اور اب یہ حالت ہے کہ وہ بھی یوں باتیں کرنے لگے! اس روحانی کوفت نے دُلاری کو اُس وقت نسوانی حمیت کا مجسمہ بنا دیا۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور اُسنے سارے گروہ پر ایک ایسی نظر ڈالی کہ ایک ایک کر کے سب نے ہٹنا شروع کیا۔ گر یہ ایک مجروح، پرشکستہ چڑیا کی پرواز کی آخری کوشش تھی۔ اُس دن رات کو وہ پھر غائب ہو گئی۔

پھر یہ ہنگامہ......

"مذہب دراصل بڑی چیز ہے۔ تکلیف میں، مصیبت میں، ناکامی کے موقعہ پر، جب ہماری عقل کام نہیں کرتی اور ہمارے حواس مختل ہوتے ہیں، جب ہم ایک زخمی جانور کی طرح چاروں طرف ڈری ہوئی بے بسانہ نظریں دوڑاتے ہیں، اُس وقت وہ کون سی طاقت ہے جو ہمارے ڈوبتے ہوئے دل کو سہارا دیتی ہے؟ مذہب! اور مذہب کی جڑ ایمان ہے۔ خوف اور ایمان۔ مذہب کی تعریف لفظوں میں نہیں کی جا سکتی۔ اسے ہم عقل کے زور سے نہیں سمجھ سکتے۔ یہ ایک اندرونی کیفیت ہے....."

"کیا کہا؟ اندرونی کیفیت؟"

"یہ کوئی ہنسنے کی بات نہیں، مذہب ایک آسمانی ضیا ہے جس کے پرتو میں ہم کائنات کا جلوہ دیکھتے ہیں۔ یہ ایک اندرونی ...."

"خدا کے واسطے کچھ اور باتیں کیجئے، آپ کو اس وقت میری اندرونی کیفیت کا اندازہ نہیں معلوم ہوتا۔ میرے پیٹ میں سخت درد ہو رہا ہے اس وقت مجھے آسمانی ضیا کی ضرورت بالکل نہیں۔ مجھے جلاب......"

ایک بار رات کو میں ناول پڑھنے میں محو تھا کہ چپکے سے کوئی میرے کمرے میں داخل ہوا اور میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ میں نے جو آنکھ اٹھائی تو کیا دیکھا کہ میاں ابلیس کھڑے ہیں۔

میں نے کہا: "ابلیس صاحب! اس وقت آخر آپ کی مراد میرے یہاں آنے سے کیا ہے؟ میں ایک بہت دلچسپ ناول پڑھنے میں مشغول ہوں، خواہ مخواہ آپ پھر چاہتے ہیں کہ میں کتاب بند کرکے آپ سے مذہبی بحث شروع کروں۔ میرے نزدیک ناول پڑھنا مذہبی باتوں میں سر کھپانے سے بہتر ہے۔ آپنے جو میرے دل میں وسوسہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے میں ہرگز اس کا شکار نہیں ہونا چاہتا۔"

میرے اس کہنے پر وہ ابلیس نما شخص مڑا اور کمرے کے باہر جانے لگا۔ اس طرح ایک فرشتے کے ساتھ برتاؤ کرنے پر میرا دل مجھے کچھ کچھ ملامت

کرنے لگا ہی تھا کہ وہ شخص یکبارگی میری طرف پلٹا اور افسوس بھری آواز میں مجھ سے کہا:

" میں ابلیس نہیں جبرئیل ہوں۔ میں تم پر اسکا الزام نہیں رکھنا چاہتا کہ تم نے مجھے ابلیس سمجھے، ابلیس بھی آخر میرا ہی ایسا ایک فرشتہ ہے۔ تم تو کیا تم سے بڑے لوگوں نے اکثر مجھے ابلیس سمجھ کر گھر سے نکال دیا۔ پیمبروں تک سے یہ غلطی سرزد ہو چکی ہے۔ بات یہ ہے کہ میں اچھائی کا فرشتہ ہوں۔ میری صورت سے تقدس ٹپکتا ہے۔ اگر ابلیس کی طرح میں حسین ہوتا تو شاید لوگ مجھے اس طرح کا برتاؤ نہ کرتے۔ اور بھلا آپ یہ کیسے سمجھے کہ میں آپ سے مذہبی بحث کرنا چاہتا ہوں؟ مجھ سے بحث سے کوئی سروکار نہیں۔ ہر بحث چونکہ وہ عقل اور منطق پر مبنی ہوتی ہے شیطانی چیز ہے۔ مذہب کی جڑ ایمان ہے اگر تمہاری جڑ مضبوط ہے تو پھر خدا خود مذہبی بحث میں تمہارا ساتھ دیتا ہے، اور جب مدد خدا شامل حال ہو تو پھر عقل سے کیا سروکار؟ مذہب دراصل بڑی اچھی چیز ہے ...."

عقل اور ایمان، آسمان اور زمیں، انسان اور فرشتہ،

خدا اور شیطان، میں کیا سوچ رہا ہوں؟ سوکھی ہوئی خشک زمین برسات میں بارش سے سیراب ہو جاتی ہے اور اُس میں سے عجب طرح کی خوشگوار سوندھی خوشبو آنے لگتی ہے۔ قحط میں لوگ بھوک مرتے ہیں۔ بوڑھے، بچے، جوان، مرد، عورت، آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے، چہرے زرد، ہڈیاں پسلیاں ابھری پڑی ہوئی کھال کو چیر کر معلوم ہوتا ہے باہر نکلی پڑ رہی ہیں۔ بھوک کی تکلیف، ہیضہ کی بیماری، قے، دست، مکھیاں، موت۔ کوئی لاشوں کو گاڑنے یا جلانے والا نہیں، لاشیں سڑتی ہیں اور اُن میں سے عجب طرح کی بدبو آنے لگتی ہے۔

ایک رئیس کے یہاں ایک ولائتی کتا پلا تھا۔ اس کا نام تھا شیرا۔ اُسکے لیے روزانہ کا راتب مقرر تھا، اور وہ عام طور سے گھر کے احاطے کے اندر ہی رہا کرتا تھا۔ کبھی کبھی بازاری کتیوں کے پیچھے البتہ بھاگتا تھا۔ جب وہ بڑا ہوا تب اسکی یہ عادت بھی بڑھی۔ محلے میں اور جو دبلے، پتلے، بازاری کتے تھے وہ جب شیرا کو آتا دیکھتے تو اپنی کتیوں کو چھوڑ کر بھاگ جاتے اور دور سے کھڑے ہو کر شیرا پر بھونکتے۔ شیرا کتیوں کے ساتھ رہتا اور ان

کتوں کی طرف رُخ بھی نہ کرتا۔ تھوڑے دنوں کے بعد اتفاق ایسا ہوا کہ
بڑا بھاری شیرا سے تقریباً دونے جسم کا بازاری کتا اس محلے میں کہیں سے آگیا
اور وہ شیرا سے لڑنے پر آمادہ ہوگیا۔ دو ایک دفعہ شیرا سے اور اُس سے جھڑپ
بھی ہوئی۔ ایسے موقع پر کتیاں تو سب بھاگ جاتیں اور سارے بازاری کتے
اپنے گروہ کے پیشوا کے ساتھ ملکر شیرا پر حملہ کرتے۔ رفتہ رفتہ شیرا کا اپنے گھر
کے باہر نکلنا ہی نہ صرف بند ہوگیا بلکہ بازاری کتوں کا گروہ اُلٹے شیرا پر حملہ کرنے
کیلیے اُسکے احاطے کے اندر آنے لگا۔ جب اس قسم کا حملہ ہوتا تو گھر میں
کتوں کے بھونکنے کی وجہ سے کان پڑی آواز نہ سُنائی دیتی۔ نوکر وغیرہ جو
قریب ہوتے وہ شیرا کو چھڑانے کے لیے لپکتے، اور بڑی بڑی مشکلوں سے
شیرا کو اسکے دشمنوں سے بچاتے۔ شیرا کئی دفعہ زخمی ہوا اور اب گھر کے
اندر چھپا بیٹھا رہتا۔ بازاری کتوں کی پوری فتح ہوگئی ایک دن
علی الصباح شیرا اپنے گھر کے احاطہ میں پھر رہا تھا کہ باہر والے کتوں کے گروہ
نے بڑے کتے کی سرکردگی میں اُس پر حملہ کیا۔ گھر میں سب سو رہے تھے،
گُل غل اور شور اتنا ہوا کہ لوگ جاگ اُٹھے۔ رئیس صاحب جن کا کتا تھا

اندر سے باہر نکل پڑے اور اس ہنگامہ کو دیکھکر اپنی بندوق اُٹھالائے۔ انھوں
نے بڑے بازاری کتے پر نشانہ لگاکر فیر کیا اور اُس کا وہیں خاتمہ کردیا۔ باقی
کتے بھاگ گئے۔ شیرا، زخمی شدہ، اپنے مالک کے قدموں پر آکر لوٹنے لگا۔
کمینے، رذیل بازاری کتوں کی کمر ٹوٹ گئی۔ شریف، خاندانی، ولائتی
کتا سلامت رہ گیا اور پھر اُسی طرح سے مزے کرنے لگا۔

انسانیت کسے کہتے ہیں؟

گومتی ہزاروں برس سے یونہیں بہتی چلی جا رہی ہے۔ طغیانیاں آتی ہیں،
آس پاس کی آبادی کو مٹا کر دریا پھر اُسی رنگ سے آہستہ آہستہ بہنے لگتا ہے۔
دریا کے کنارے ایک جگہ ایک چھوٹا سا مندر ہے۔ اس مندر کی نیو معلوم
ہوتا ہے بالو پر تھی۔ بازو کو دریا کے دھارے نے کاٹ دیا۔ مندر کا ایک
حصہ جھک گیا۔ اب مندر ترچھا ہوگیا۔ مگر ابھی تک قائم ہے۔ تھوڑے
دن کے بعد بالکل مسمار ہو جائے گا۔ تھوڑے دن تک کھنڈر کا نشان
رہے گا۔ اسکے بعد جہاں مندر پہلے تھا وہاں سے دریا بہنے لگے گا۔
آج تیوہار ہے۔ نہان کا دن ہے۔ صبح سویرے سے دریا کے

کنارے کے مندروں اور گھاٹوں پہ بھیے بڑ۔ لوگ منتر پڑھتے ہیں اور
ڈبکیاں لیتے جاتے ہیں۔ دریا کا پانی میلا معلوم ہوتا ہے۔ لہروں پر گیندے
اور گلاب کے پھولوں کی پنکھڑیاں اوپر نیچے ہوتی ہوئی بہتی چلی جارہی ہیں۔
کہیں کہیں کناروں پر جاکر بہت سے پھول، پتیاں، چھوٹے چھوٹے لکڑی
کے ٹکڑے، پیئے ہوئے سگرٹ، عورتوں کے کپڑوں سے گری ہوئی سنہری
چمکیاں، مردہ مچھلی اور اسی قسم کی اور چیزیں اکٹھے ہوکر رک گئی ہیں۔

گومتی ندی، شیرا کتا، مردہ مچھلی، آسمان پر تیرتے ہوئے بادل اور زمین
پر سڑتی ہوئی لاشیں، ان سب پر رحمت خداوندی اپنا سایہ کئے ہوئے ہے۔

کلو مہتر کے جوان لڑکے کو سانپ نے ڈس لیا۔ برسات کا موسم تھا،
وہ صحن میں زمین پر سو رہا تھا۔ صبح ہوتے ہوئے، اسکی بائیں کہنی کے قریب
سانپ نے کاٹا۔ اس کو خبر تک نہیں ہوئی۔ پانچ بجے صبح کو وہ اٹھا، بازو
پر اسنے نشان دیکھے، خفیف سی تکلیف محسوس کی۔ اپنی ماں کو اسنے
یہ نشان دکھائے اور یہ خیال کرکے کہ کسی کیڑے مکوڑے کے کاٹنے کا نشان
ہے، وہ جھاڑو دینے میں مشغول ہوگیا۔ کلو مہتر اور اسکے سارے بیوی بچے

ایک گھر میں نوکر تھے۔ ان کی پندرہ روپیہ مہینہ تنخواہ تھی، رہنے کیلئے شاگرد پیشہ
میں ایک کوٹھری تھی، جس میں کلو، اسکی بیوی، اسکی دو لڑکیاں اور اسکا
لڑکا، سب کے سب رہتے تھے۔ پندرہ روپیہ مہینہ، ایک کوٹھری، اور کبھی کبھی
بچا ہوا جوٹھا کھانا اور پھٹے پرانے کپڑے، کلو کو جن صاحب کے یہاں یہ سب
کچھ ملتا تھا وہ ان کو خدا سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ کلو کا لڑکا دس پندرہ منٹ سے زیادہ
کام نہ کر سکا۔ اس کا سر گھومنے لگا اور اسکے بدن بھر میں سرسراہٹ
محسوس ہونے لگی۔ چھ بجتے بجتے وہ پلنگ پر گر کر ایڑیاں رگڑنے لگا۔ اسکے
منہ سے پھین نکلنے لگا، اسکی آنکھیں پتھرا گئیں۔ زہر اسکے رگ و پے
میں سرائت کر گیا اور موت نے اسے اپنے بیدرد شکنجے میں جکڑ لیا۔
اسکے ماں باپ نے رونا شروع کیا۔ سارے گھر میں خبر مشہور ہوگئی کہ کلو کے
لڑکے کو سانپ نے ڈس لیا۔ سب نے دوا درمن تجویز کیا۔ کلو کے آقا کے
صاحبزادے بہت زیادہ غریب پرور اور رحمدل تھے۔ وہ خود کلو کی کوٹھری
تک آئے، اور کلو کے لڑکے کو خود انھوں نے اپنے ہاتھ سے چھوا اور دوا
پلائی۔ مگر کلو کی اندھیری کوٹھری اتنی زیادہ گندی تھی اور اس میں اتنی

بر بر تھی کہ صاحبزادے سے چار پانچ منٹ بھی نہ ٹھہرا گیا۔ رحمدلی اور غریب پروری کی آخر ایک انتہا ہوتی ہے۔ وہ واپس تشریف لاکر اچھی طرح نہائے، کپڑے بدل کر رومال میں عطر لگاکر سونگھا تب جاکر انکی طبیعت درست ہوئی۔ رہا کلو کا رڈ کا وہ بدنصیب ایک بجے کے قریب مر گیا۔ اسکی کوٹھری سے رونے پیٹنے کی آواز رات تک آتی رہی، جسکی وجہ سے سارے گھر میں اداسی چھاگئی۔ تجہیز وتکفین کیلئے کلو نے دس روپے پیشگی لیے۔ رات کو آٹھ، نو بجے کے قریب کلو کے لڑکے کی لاش اٹھ گئی۔

حامد صاحب اپنی رشتہ کی بہن سلطانہ پر عاشق تھے۔ حامد صاحب نے سلطانہ بیگم کو صرف دور سے دیکھا ہے۔ ایک دو لفظوں کے علاوہ کبھی آپس میں ان سے دیر تک باتیں نہیں ہوئیں۔ مگر عشق کی بجلی کیلیے لفظوں کی، گفتگو کی، جان پہچان کی کیا ضرورت ؟ حامد صاحب دل ہی دل میں جلا کرتے، جھوم جھوم کر شعر پڑھتے، اور کبھی کبھی جب عشق کی شدت ہوتی تو غزل لکھ ڈالتے اور رات کو دریا کے کنارے جاکر چپ بیٹھتے، اور ٹھنڈی سانسیں بھرتے۔ صرف ان کے دو گہرے دوست

حامد کے عشق کا راز جانتے تھے۔ اس طرح اپنے دل کی آگ چھپانے پر وہ حامد کی تعریف کیا کرتے تھے۔ شرفا کا دستور یہی ہے:۔

دیکھنا بھی تو انھیں دور سے دیکھا کرنا
شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا !

حامد ہفتہ میں ایکبار سے زیادہ شاید ہی اپنے چچا کے گھر جاتے رہے ہوں۔ مگر جانے کے ایک دن پہلے سے ان کی بیچینی کی انتہا نہ رہتی۔ شاعر نے ٹھیک کہا ہے:

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک
آتش شوق تیز تر گردد

ان کے دوست جب حامد کی یہ کیفیت دیکھتے تو مسکراتے اور ذیل کا شعر پڑھتے:۔

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

حامد صاحب شرماتے، ہنستے، خفا ہوتے، گھبراتے، دل پر ہاتھ رکھتے

اور اپنے دوستوں سے التجا کرتے کہ انھیں چھیڑیں مت۔

سلطانہ بیگم شریف زادی ٹھریں۔ عشق یا محبت کے الفاظ، باعصمت بہو بیٹیوں کی زبان تک آنا نامناسب ہیں۔ انھوں نے اپنے حامد بھائی سے آنکھ ملا کر شاید ہی کبھی بات کی ہو مگر جب وہ حامد بھائی کو اپنے سامنے گھبراتے اور جھینپتے دیکھتیں تو دل ہی میں سوچتیں کہ شاید عشق اسی چیز کا نام تو نہیں! حامد بیچارے کو پاک محبت تھی اسلئے اگر کبھی سلطانہ بیگم اور وہ کمرے میں چند منٹ کیلیے اکیلے رہ بھی جاتے تو سوائے اسکے کہ وہ ڈرتے ڈرتے بہت دبی ہوئی ایک ٹھنڈی سانس لیں اور کسی "ناجائز" طریقے سے اظہار عشق نہ کرتے۔ ایک مدت تک عشق کا سلسلہ یوہیں جاری رہا۔

جب حامد صاحب کی نوکری ہوگئی تو ان کے دل میں شادی خیال آیا۔ ان کے والدین کو بھی اسکی فکر ہوئی۔ سلطانہ بیگم کی والدہ بھی اپنی بچی کیلیے بر کی تلاش میں تھیں۔ حامد صاحب نے بڑی مشکل سے اپنی والدہ کو اس بات سے آگاہ کروادیا کہ وہ سلطانہ بیگم سے شادی کرنی چاہتے ہیں۔

شادی کا پیام بھیجا گیا۔ مگر سلطانہ بیگم کی والدہ کو حامد میاں کی والدہ

کی صورت سے نفرت تھی۔ ہمیشہ سے ان دو خاتونوں میں عداوت اور دشمنی تھی۔ حامد میاں کی والدہ اگر اچھے سے اچھا کپڑا اور زیور بھی پہنے ہوتیں، تب بھی سلطانہ بیگم کی ماں، ان پر کوئی نہ کوئی فقرہ ضرور کستیں، اور انکے لباس میں کچھ نہ کچھ عیب ضرور نکالتیں۔ اگر ایک کے پاس کوئی زیور ہوتا، جو دوسرے کے پاس نہ ہوتا، تو دوسری بیگم ضرور آئندہ ملاقات کے موقع پر اس سے بہتر اسی قسم کا زیور پہنے ہوتیں۔ ایک گھر سے برخواست شدہ ماما کو دوسرے گھر میں ضرور نوکری ملتی۔

حامد میاں کے گھر سے جب شادی کا پیام آیا تو سلطانہ بیگم کی والدہ نے ہنس کر بات ڈال دی۔ انھوں نے کوئی صاف جواب نہیں دیا۔ وہ چاروں طرف نظر دوڑا رہی تھیں اور چاہتی تھیں کہ پہلے سلطانہ بیگم کیلیے کوئی بر ڈھونڈھ لیں اسکے بعد حامد میاں کی نسبت سے صاف صاف انکار کردیں۔ حامد میاں کی والدہ ان ترکیبوں کو خوب سمجھتی تھیں، انکے غصہ کی کوئی انتہا نہ تھی۔ جب خاندان میں اچھا خاصہ، صحیح سالم، کماتا کھاتا، سعادت مند لڑکا موجود ہو تو سلطانہ کی گھر سے باہر شادی

کرنے کے کیا معنی ؟

مگر حامد کو عشق صادق تھا، انھوں نے اپنی والدہ سے کہا کہ وہ کوشش کیے جائیں۔ یوہیں ایک مدت گزر گئی۔ کچھ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ سلطانہ بیگم کی والدہ کو اپنی لڑکی کیلیے اس درمیان میں کوئی مناسب بر بھی نہیں ملا۔ سلطانہ بیگم کی عمر اُنیس برس کی ہوگئی۔ ان کی والدہ اب زیادہ انتظار نہ کرسکیں آخر کار وہ رضامند ہوگئیں۔

حامد میاں کی سلطانہ بیگم سے شادی ہوگئی۔ ان کی شادی ہوے دو برس سے کچھ زیادہ ہوگئے۔ عاشق کی مراد برائی۔ خدا کے فضل سے گھر میں دو بچے بھی ہیں۔

ایک غریب عورت ایک تاریک اندھیری کوٹھری میں، ایک ٹوٹی ہوئی جھلنگی چارپائی پر پڑی کراہ رہی ہے۔ درد کی تکلیف اتنی ہے کہ سانس نہیں لی جاتی۔ رات کا وقت ہے اور سردی کا موسم۔ عورت کے بچہ ہونے والا ہے۔

ایک اندھیری رات میں ایک غریب عورت، سب سے چھپا کر،

چپکے سے، اپنے غریب عاشق سے ملنے گئی۔ جب اس عورت کو موقع ملتا وہ اس مرد سے ملنے جاتی۔

عشق کی لذت، موت کی تکلیف۔ یہ پہاڑ جن کی چوٹیاں نیلے آسمان سے جاکر ٹکراتی ہیں کیوں کھڑے ہیں؟ سمندر کی لہریں۔

گھڑی کی ٹک ٹک اور پانی کے ایک ایک قطرے کے ٹپکنے کی آواز، اور خاموشی، اور دل کی دھڑکن۔ محبت کی ایک گھڑی۔ رگوں میں خون کے دوڑنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ آنکھیں گفتگو کرتی ہیں اور سنتی ہیں۔

سور، پاجی، اُلو، حرامزادہ........ گالیاں اور سخت تیز دھوپ، جو کھال کو معلوم ہوتا ہے جھلسا کر ہڈی تک پگھلا دے گی۔ ایک زمیندار اور اُن کا کاشتکار، جس کے پاس لگان دینے کے روپے نہیں۔ صاحبزادے نے والد کو دوسرا خط بھیجا ہے جس میں اُن سے بہ تاکید روپے مانگے ہیں۔ وکالت کے امتحان کی فیس چار دن کے اندر جانی ضرور ہے۔ والد صاحب اپنے صاحبزادے کی تعلیم کیلیے کاشتکار سے روپے وصول کر رہے ہیں۔

چاروں طرف سانپ رینگ رہے ہیں۔ کالے کالے، لمبے لمبے۔ پھن

اُٹھا اُٹھا کر جھوم رہے ہیں۔ اِن کو کون مارے؟ کس چیز سے ماریں؟

برسات میں بادل کی گرج، اور پہاڑوں کی تنہائی میں ایک چشمے کے بہنے کی آواز، لہلہاتے ہوئے شاداب کھیت اور بندوق کے فیر کی تڑاتے دار صدا اسکے بعد ایک زخمی سارس کی دردناک قائیں، قائیں، قائیں۔

بادل نہیں آتے

اور بادل نہیں آتے۔ نگوڑے بادل نہیں آتے۔ گرمی اس تڑاخے کی پڑ رہی ہے کہ معاذ اللہ! تڑپتی ہوئی مچھلی کی طرح بھُنے جاتے ہیں۔ تمازتِ آفتاب اور دھوپ کی تیزی! بھاڑ بھی کیا ایسا گرم ہوگا۔ پوری دوزخ ہے۔ کبھی دیکھی بھی ہے؟ نہیں دیکھی تو اب مزا چکھ لو۔ وہ موئی چلچلاتی دھوپ ہے کہ اپنے ہوشوں میں تو دیکھی نہیں۔ چیل انڈا چھوڑتی ہے۔ ہرن تو کالے ہو گئے ہونگے۔ بھئی کوئی پنکھے ہی کو تیز کر دو۔ سکون تو ہو جاتا ہے۔

خاموشی: خاموشی: سستی اور پستی اور پستی اور سستی۔

بچپن میں سُنتے تھے کہ ہمالیہ پہاڑ کے دامن میں ایک بڑا غار ہے۔ اونچے، آسمان سے باتیں کرتے ہوئے پہاڑ، سخت اور گھنے، اور ایک

پہلو میں ایک موکھا، بڑا اور عمیق اور اندھیرا — اور اُس کے منہ پر ایک بڑی
چٹان رکھی رہتی ہے۔ اس غار میں بادل بند رہتے ہیں۔ سفید اور بھوری
اور کالی گائیں بند رہتی ہیں۔ کیا کیا بھی احمق خیالات ہوتے ہیں۔ جہالت
کی بھی کوئی حد ہے؟ کتنا ہی سمجھاؤ سمجھ میں نہیں آتا۔ ایک ہی لاٹھی سے
بیل اور بکریوں کو ہانکتے ہیں۔ ہم کوئی کتے ہیں کہ بھونکے چلے جائیں؟ بھوں،
بھوں، بھوں! کوئی سنتا تک نہیں۔ عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں۔ ارے کوئی تو
بتاؤ عقل بڑی کہ بھینس۔ بھینس بڑی ہے بھینس۔ بھینس! عقل کی دم
میں نمدا۔ زیادہ کہو تو ڈنڈا لے کے پل پڑے۔ مولویوں کے بھی کہیں عقل
ہوتی ہے؟ عقل! عقل۔ صورت نہ شکل، بھاڑ میں سے نکل۔ اور داڑھی
نے قلب پر سیاہی چھا رکھی ہے۔ دماغ کو استعمال نہیں کرتے۔ سمجھ کو چھپّر
پر رکھ دیا۔ طاق میں سے کتاب اُتاری، ہل ہل کے پڑھ رہے ہیں، جھک
جھک کے پڑھ رہے ہیں۔ واہ! میاں مٹھو، واہ! خوب بولے! پڑھو، میاں
مٹھو، پڑھو۔ حق اللہ پاک ذات اللہ، پاک نبی رسول اللہ۔ نبی جی بھیجو۔
یا اللہ بھیج! مولوی صاحب بچہ کی تمنا ہے؛ سخت آرزو ہے۔ نہ معلوم

کیا گناہ کیا ہے، جس کی سزا مل رہی ہے۔ گھبرائیے نہیں۔ دو تعویذ دیتا ہوں۔
حقیر فقیر، ناچیز و گنہگار ہوں۔ لیکن کلام الٰہی ہے؛ انشاء اللہ مراد حاصل
ہوگی۔ عشاء کے بعد غسل کر کے سات بار درود شریف پڑھ کر لوبان کی دھونی
کے ساتھ ہمبستری کے وقت زیرناف باندھ دیجئے گا۔ دوسرا پانی میں گھول کر
ایک صراحی یا کسی اور برتن میں رکھ لیجئے گا اور سات روز آبِ زمزم ملا کر
نہار منہ پی لیا کیجئے گا۔ اگر خدا نے چاہا تو مراد ضرور برآئے گی۔ یہ نذرانہ ہے۔
لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم!! تم کو شرم نہیں آتی؟
سمجھتے ہو کہ اللہ کا کلام خریدا جا سکتا ہے؟ خدا کو بھی مول لو گے؟ میں نذرانہ
وزرانہ نہیں لیتا۔ جاؤ کسی ٹٹ پونجیے کے پاس؛ جاؤ۔ بھاگ یہاں سے!
نکل! حضرت سخت قصور ہوا، معافی چاہتا ہوں۔ آئندہ ایسی گستاخی
نہ ہوگی۔ اچھا خیر! جا۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ نوچندی جمعرات کو
بڑے پیر صاحب کی نیاز دلوا دینا، اور سوا روپیہ اور پاؤ بھر موتیا کے
پھول ہرے بھرے صاحب کے مزار پر چڑھا دینا۔ قہ آری ھوا آ عیب
اآآ آبکی دستا آبر موباارک میں خہ تن گا آ آ۔ مولوی صاحب

کھائی۔ ہاں بیٹا خوب کھائی۔ اجی مولوی صاحب کھائی۔ ہاں، ہاں بیٹا
خوب کھائی۔ نہیں مولوی صاحب کھائی! ابے کہہ تو دیا کھائی،
ہاں خوب کھائی" اُوب!! انگریزوں کو خدا غارت کرے۔ انگریزی
پڑھا پڑھا کر دہریہ بنا ڈالا۔ زنخا بنا ڈالا۔ مردانگی کی ناک کاٹ کے
لے گئے۔ نہ دوزخ کا ڈر نہ جنّت کی خواہش۔ پڑھا پڑھایا سب خاک میں
ملا دیا۔ ہمارا مذاق اڑاتے ہیں؛ خدائے پاک پر ہنستے ہیں۔ جب آگ
میں جلیں گے تو۔ اور ایک سادھو اُس غار کا مُنہ برسات میں کھول دیتا
ہے۔ بادل بھڑ بھڑ اُڑ نکلتے ہیں۔ مُن مُن سکھی نکھی کا بیاہ ہوتا تھا...
تاتّل مُمولہ ناچتی تھی۔... بس تو خوب بولا پودنا سُنائی... تیتری، بھنبھیری
بکوکر نال تیری... پربتی جونائیں آئی ساری صبا بھگائی۔ بھاڑ، بھاڑ،
سب برات اُڑ گئی۔ اب تو ہوا اُکھڑ گئی؛ ہوا۔ ابھی دیکھو کیا ہوتا ہے۔
خدا نیک ہدایت دے۔ سچ ہے قیامت کے سب آثار موجود ہیں۔ آگ اُگلتا
ہوا سانپ! تفرقے، جھگڑے، لڑائیاں، مذہب اور خدا کی توہین:
زمیں کا طبقہ پلٹ رہا ہے۔ جب یونان کا طبقہ اُلٹا تھا تو یہ ہی سب علامات

موجود تھیں۔ یا اللہ رحم کر! یہ جاہل ہیں! یہ نہیں سمجھتے کہ کیا کہہ رہے
ہیں۔ تو ربّ العالمین ہے! ان کو معاف کر۔

بادل کیوں نہیں آتے؟ اور زندگی وبال ہے۔ وبال۔ بال۔
لمبے لمبے، کالے، کالے بال۔ ایک فضول کی لادی لدی ہوئی ہے۔
آخر ہم بھی مردوں کی طرح کیوں نہیں کٹوا سکتے؟ چھوٹے چھوٹے بالوں سے
سر کیسا ہلکا معلوم ہوتا ہوگا۔ خدا بخشے ابّا جان کے تو خشخاشی تھے۔ ایک مرتبہ
ایسی ہی گرمی پڑی تو پان بھی بنوا لیا تھا۔ اور میں نے اور صابرہ نے خوب
ہی سر سہلایا۔ کاش کہ ہمارے بال بھی کٹتے ہوتے۔ گدّی تو جلی جاتی ہے
جھلسی جاتی ہے۔ اُس پر بھی بال نہیں کٹوا سکتے۔ خاندان والوں کی کیا
بُری ناک ہے، ہم جو بال کٹوا لینگے تو اُن کی ناک کٹ جائیگی۔ اگر میں کہیں
لڑکا ہوتی تو کھونڈی چھری سے کاٹ ڈالتی، جڑ سے اُڑا ڈالتی۔ اور جب
ناک ہی نہ رہتی تو کٹنے کا ڈر کہاں؟ خدا گنجے کو ناخون ہی نہیں دیتا۔
زخم کے بھرنے تک ناخن نہ بڑھ آئینگے کیا؟ زخم تو بھر آیا لیکن ناخون
ہی نہیں جو زخم زخم — رحم ارحم، الرّاحمین۔ کیا خدا بھی رحموں کے

مجموعے رہنا ہے؟ آخر ہم ہی میں رحم کو کیوں پیدا کیا؟ عورت کمبخت ماری کی
بھی کیا جان ہے، بچھڑی سے بدتر۔ کام کرے، کاج کرے! سینا، پرونا،
کھانا پکانا۔ صبح سے رات تک جلے پاؤں کی بلی کی طرح ادھر پھرنا اُدھر پھرنا۔ اور
اس پر طرہ یہ کہ بچے جننا۔ جی چاہے یا نہ چاہے جب میاں موئے کا جی چاہا،
ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا۔ ادھر آؤ میری جانی، میری پیاری۔ تمہارے نخرہ میں
گرم مصالح۔ دیکھو تو کمرہ میں کیسی ٹھنڈک ہے! میرے کلیجہ کی ٹھنڈک!
ورے آؤ۔ ہٹو پرے! تم پر ہر وقت کمبخت شیطان ہی سوار رہتا ہے!
نہ دن دیکھو نہ رات۔ ہار! مار ڈالو۔ کٹاری مار دو نا۔ ہاتھ نگوڑا مروڑ ڈالا،
توڑ ڈالا۔ کہاں بھاگی جاتی ہو؟ سینے سے چمٹ کے لیٹ جاؤ! دیکھو کٹاری
کا مزہ چکھ لو۔ وہ ہی موئے دودھوں پر ہاتھ چل پڑے۔ سخت سخت انگلیوں سے
مسل ڈالا، دَسل ڈالا۔ کمبخت نے گھنڈی کو کس زور سے دبایا کہ بل بھی نہ سکی۔
موا جوانا مرے۔ کوٹھے والیوں کے ساتھ بھی کوئی ایسا برتاؤ نہ کرتا ہوگا۔ کمزور
جان لیٹ گئی کہ سارا گرمی کا غصہ مجھ ہی پر اُترا۔ مُردے کی طرح کیوں پڑی
ہو! کیا جان نہیں؟ زور لگاؤ۔ پیاری، پی آ رہی۔ جہ آ آ آئی۔

اور ہم ہیں کہ کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم کیوں نہیں کچھ کر سکتے؟ اگر اپنا روپیہ ہوتا تو یہ
سب ذلت کیوں سہنی پڑتی۔ جس وقت جو جی چاہتا کرتے۔ کمانے کی اجازت
بھی تو نہیں۔ پردے میں پڑے پڑے سڑتے ہیں۔ لونڈیوں سے بدتر زندگی
ہے۔ جانوروں سے بھی گئے گزرے ہوئے۔ پنجرے میں پڑے ہیں، قید
کئے پڑے ہیں۔ پر بھی تو پھڑ پھڑانے کی گنجائش نہیں۔ ہماری
زندگی ہی کیا ہے! بجھا دیا تو بجھ گئے تھے، جلا دیا تو جل رہے
ہیں۔ ہر وقت جلا کرتے ہیں۔ جلنے کے علاوہ اور کچھ بھی ہماری قسمت میں
ہے؟ اور فرمان برداری کریں۔ مرد موئے سارے میں جوتیاں چٹخاتے
پڑے پھرتے ہیں۔ کہیں بیٹھ کے حقہ گڑ گڑایا! کہیں گپیں کیں! کہیں گنجفہ،
کہیں شطرنج! کہیں موئے تاش۔ رات کو اور کچھ نہیں تو چاوڑی چلے گئے۔
گانا سننے کا بہانہ! لیکن پھر صبح نہانا کیسا؟ اور کہہ کر ہمیں جلانا۔
کہیں جل بھی تو نہیں چکتے۔ لاکھ لاکھ آنسو بہاتے ہیں! موئی آگ ایسی چوبیس
گھڑی کی لگی رہتی ہے کہ ذرا بجھنے کا نام نہیں لیتی۔ موت بھی تو نہیں آتی۔
ہندوؤں کی زندگی ہم سے کہیں اچھی ہے۔ آزادی تو ہے۔ عیسائیوں کا تو

کیا کہنا۔ جو جی میں آتا ہے کرتی ہیں۔ ناچ ناچیں، تصویریں دیکھیں، بال کٹائیں۔ راوی چین لکھتا ہے۔ نہیں معلوم کس گھڑی ہماری پیدائش ہوئی جو مُسلمان گھر میں جنم لیا۔ آگ لگے ایسے مذہب کو۔ مذہب، مذہب، مذہب روح کی تسلّی۔ مَردوں کی تسلّی ہے! عورت بیچاری کو کیا! پانچ انگشت لانبی ڈاڑھی لگا کے بڑے مسلمان بنتے ہیں۔ ٹٹّی کی آڑ میں شکار کرتے ہیں۔ ہمارے تو جیسے جان تک نہیں۔ آزادی کیلیے تو دیوارِ قہقہہ ہیں۔ ابّا جان نے کس مصیبت سے اسکول میں داخل کیا تھا۔ مشکل سے آٹھویں تک پہونچی تھی کہ خدا بخشے دُنیا سے سدھار گئے۔ سب نے فوراً ہی تو اسکول سے نام کٹا دیا! اور اِس موٹے مُشٹنڈے، ڈاڑھی والے کے ساتھ نتھی کر دیا۔ مُوا شیطان ہے۔ عورت کی آزادی تو آزادی عورت کا جواب تک دینا گوارا نہیں کرتا۔

کیا سمندر سوکھ گئے، جو بادل نہیں آتے؟ سُوکھ گئے۔ سمندر بھی سُوکھ گئے۔ سمندر، سات سمندر پار سے آئے، ہماری بھی لٹیا ڈوب گئی۔ غُڑپ، غُڑپ، غُڑپ، غوطے لگا رہے ہیں! اپنے ہی خون میں

نہا رہے ہیں۔ دُھوپ تو اِتنی تیز ہے، بھاپ بھی نہیں بنتی۔ کاہے کی بھاپ بنے، خون تو خُشک ہو گیا، جل کے راکھ ہو گیا۔ لیکن کیا سچ مُچ بادل بھاپ کے بنتے ہیں؟ ہم تو سُنا کرتے تھے کہ بادل اسپنج کی طرح ہوتے ہیں! ہواؤں میں تیرا کرتے ہیں۔ جب گرمی بہت سخت پڑی، پیاس کے مارے سمندر کے کنارہ اُتر پڑتے ہیں: خوب پانی پیتے ہیں اور پھر ہوا میں اڑ جاتے ہیں۔ شاید ہماری سرکار کے بحری بیڑے کے ڈر سے اُڑ جاتے ہیں۔ اور توپوں کے خوف سے مُوتنے لگتے ہیں۔ تُبَّل ہَتَّل موتنے لگتے ہیں۔ جو کچھ بھی اسکولوں میں پڑھاتے ہیں جُھوٹ بکتے ہیں۔ بادل واقعی بھاپ کے نہیں ہوتے۔ جغرافیہ غلط، خوف برطانیہ دُرست، دُرست۔ یہ ہی بات ہے۔ اُوخو آج، سمجھ میں آیا۔ کیا سمجھے؟ بحری بیڑا اور توپ۔ لیکن افغان بھی کیا تُکّ مارتا ہے۔ چٹانوں کی آڑ میں چُھپا رہتا ہے۔ جہاں دُشمن کو دیکھا، ایک آنکھ بھینچ۔ شاید دونوں ہی آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ گھوڑا دبایا۔ ٹھائیں! ۔ ٹپ سے زندہ جان مردہ کی طرح گر پڑی۔ خوب مارا! خوب۔ لیکن افغان تو پیدل چلتا ہے۔ مگر ہوائی جہاز کو ایک گولی سے گرا لیتا ہے۔ ہمارے پاس تو موٹر

چھوڑتا کا بھی نہیں۔ ہم کیا کرینگے؟ چلو جلیاں والا باغ کی سیر کر آئیں۔ مگر جائینگے
کاہے میں؟ ہم بتائیں۔ سر کنڈے کی گاڑی، دو بیل جوتے جائیں۔ واہ بھی
واہ! خوب سنائی۔ اتنے سارے آدمی اور سر کنڈے کی گاڑی! پاگل ہے بھئی،
پاگل۔ پیری ہے بے لمڈو، پیری ہے۔ سفیدے کی پیری ہے۔ وہ کاٹا۔ یوں
ہیں تو یوں سہی۔ ہُش ہِش میرے کان میں گھس۔ سب کو کان میں گھسا لینگے۔
پاگل ہے بھئی پاگل ہے۔ وہ کاٹا! یہ ہی تو مصیبت ہے سنتے تک نہیں۔ اِس
کان سے سُنا، اُس کان سے نکال دیا جوں تک نہیں چلتی۔ گھر ابھی کیا چکنا ہوگا۔
مٹی میں پڑے رَوندتے ہیں! صورت تک کو نہیں سنبھالتے۔ کیا شعر تھا؟ کیا؟
ہم نے اپنی صورت بگاڑ لی، اُن کو تصویر بنانی آتی ہے۔ کیا تھا؟ ایک ہم
ہیں۔ ہاں، ہم! یہ ہی ہم جن کو اپنی صورت کا احساس نہیں۔ کالے بھجنگے،
میلے کچیلے، لنگوٹی میں مست ہیں۔ بھائی بندوں میں سے کسی نے
کوئی بات کہہ دی، لڑنے مرنے پر آمادہ۔ اور دو سرے جو گلا کاٹے ڈالتے
ہیں اُس کا کچھ بھی نہیں۔ جوتے کھاتے ہیں؛ لاتیں سہتے ہیں؛ گالیاں سنتے
ہیں، اور پھر وہی لونڈوں کی سی بات، اُکے تومار۔ چاٹ! اچھا اُکے

تو مارلیا، اُکے تو مار۔ چاٹ! چاٹ! بھیں، بھیں، بھیں۔ دیکھو
بی اماں، چُنّو کا بچہ نہیں مانتا! جب سے بڑ بڑ مارے جا رہا ہے۔ اُس کو
سمجھالو نہیں تو اس حرامزادے کی........ ماشاراللہ۔ چشم بد دور۔
چشم بندوق۔ کیا میٹھی گالی دی ہے، مُنہ چوم لے، مُنہ۔ زبان گُدّی
کے پیچھے سے کھینچ کے نکال ڈالے۔ ایسا چانٹا مارے کر سارا بھونڈا پن دُور ہو
جائے۔ کُتّے کی طرح مارتے ہیں؛ تمہی دکھا کے مارتے ہیں؛ اجی پاس
بُلا کے مارتے ہیں؛ گھیر کے مارتے ہیں گھار کے مارتے ہیں؛ پیار کر کے
مارتے ہیں، دُلار کر کے مارتے ہیں؛ اور تو اور، مار کر کے مارتے ہیں۔
اور ہم ہیں کہ کُتّے کی ذات پھر اُن کے جوتوں میں گھُسے جاتے ہیں۔ افسوس
تو یہ ہے کہ گو تک نہیں ملتا۔ آخ تھو۔ کالے کُتّے کا گو! لعنت تم جیسوں پر۔
بس بے چھوٹم؟ بس؟ چُنّو کی گالی سہ لی۔ مار! مار! دیکھتا کیا ہے؟
لپک کے! دے دبا کے ہاتھ! مار!۔ اور راجہ ماری پودنی ہم بیر
بساؤن جائیں۔ آپکی صورت تو ملاحظہ ہو۔ کیا پدّی کیا پدّی کا شوربا۔ ہم بیر
بساؤن جائیں۔ واہ میرے سینخ کے پہلوان، واہ! کوئی پھبتی کہو، خدا

لگتی کہو۔ ہم بیر بساون جائیں۔ ہاں، بیر کہتے تو ایک بات بھی تھی۔ میاں شیخوپورے کے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ کبھی سہارن پور کے بیروں کا بھی نام سُنا ہے؟ اجی حضرت بیل ہو نگے، بیل۔ جی ہاں، بجا فرمایا، درست، بیل ہی تو تھے۔ ہم بیر بساون جائیں! سرکنڈوں کی گاڑی دو بیل جوتے جائیں۔ اور؟ — راجہ ماری پودنی ہم بیر بساون جائیں۔ واہ میاں پودنے بڑی ہمت کی! ہمتی کا شیر ہے نا؟ سرکنڈوں کی گاڑی میں بیٹھے گا، بیلوں پر، کہ

راجہ ماری پودنی ہم بیر بساون جائیں۔

کھاوٹوں کی ایک رات

گڑ! گڑ! گڑڑڑا الٰہی خیر! معلوم ہوتا ہے کہ آسمان ٹوٹ پڑے گا۔ کہیں چھت تو نہیں گر رہی! گڑڑڑڑ!

اسکے ساتھ ہی ٹوٹے ہوئے کواڑوں کی جھریاں ایک تڑپتی ہوئی روشنی سے چمک اُٹھیں۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے نے ساری عمارت کو ہلا ڈالا۔ ٹُو ٹُوووو! کیا سردی ہے! یخ جمی جاتی ہے، برف جمی جاتی ہے۔ کپکپی ہے کہ سارے جسم کو توڑے ڈالتی ہے۔

ایک چھوٹا سا مکان ۱۲ سے ۱۴ فٹ اور اُس میں بھی آدھے سے زیادہ میں ایک تنگ دالان اور اُسکے پیچھے ایک پتلا سا کمرہ، نیچا اور اندھیرا۔ کوئی فرش تک نہیں۔ کچھ پھٹے پُرانے بوریے اور ٹاٹ زمین پر بچھے ہیں جو گرد اور میل سے چپ چپ کر رہے ہیں۔ کونوں میں بقچیوں اور گودڑ کا ڈھیر ہے۔

ایک اکیلا کاٹ کا ٹوٹا ہوا صندوق، اس پر بھی مٹی کے برتن جو سالہا سال کے
استعمال سے کالے ہو گئے ہیں، اور ٹوٹتے ٹوٹتے آدھے پونے رہ گئے ہیں۔ ان
میں ایک تانبے کی پتیلی بھی ہے۔ کنارے جھڑ چکے ہیں! برسوں سے قلعی
تک نہیں ہوئی! گھستے گھستے پیندا جواب دینے کے قریب ہے۔

چھت ہے کہ کڑیاں رہ گئی ہیں۔ اور اس پر بارش! یا اللہ کیا چھاوٹیں
اب کے ایسی برسیں گی کہ گویا ان کو پھر برسنا ہی نہیں؟ اب تو روک دو! کہاں جاؤں،
کیا کروں؟ اس سے تو موت ہی آ جائے۔ تو نے غریب ہی کیوں بنایا؟ یا
اچھے دن ہی نہ دکھائے ہوتے۔ یا یہ حال ہے کہ لیٹنے کو جگہ نہیں۔ چھت چھلنی
کی طرح ٹپکی جاتی ہے۔ بلی کے بچوں کی طرح سب کونے جھانک لیے۔ لیکن چین
کہاں؟ میرا تو خیر کچھ نہیں، بچوں نگوڑے ماروں کی مصیبت ہے۔ نہ معلوم
سو بھی کیسے گئے ہیں۔ سردی ہے کہ اُف! بوٹی بوٹی کانپی جاتی ہے!
اور اس پر ایک لحاف، اور چار جانیں! اے میرے اللہ ذرا تو رحم کر!
یاد وہ زمانہ تھا کہ محل تھے، نوکر تھے، فرش اور پلنگ تھے۔ آہ وہ میرا کمرہ!
ایک چھپر کھٹ سنہری پردوں سے زرق برق، مخمل کی چادریں اور سنبل کے

تکیے۔ کیا نرم نرم تو شک تھی کہ لیٹے سے نیند آ جائے۔ اور لحاف؟ آہ!
ریشمین چھینٹ کا، اور اُس پر پنچ ٹھپے کی گوٹ۔ انائیں، مامائیں کھڑی ہیں۔
بیوی سر دباؤں؟ بیوی پیر دباؤں؟ کوئی تیل ڈال رہی ہے، کوئی ہاتھ
مل رہی ہے۔ گدگدا گدگدا بستر، اوپر سے یہ سب چونچلے، نیند ہے کہ کہکشانی
کپڑے پہنے سامنے کھڑی ہے...... سبز شیشوں پر نیلے اور سرخ اور نارنجی
عکس، بڑے بڑے ہشت پہل جواہرات کے سابوت ڈلے جگمگ جگمگ کر رہے
ہیں...... دسترخوان پر چاندی کی طشتریاں، ایک جھلملاہٹ، قورما، پلاؤ،
بریانی، متنجن، باقرخانیاں، میٹھے ٹکڑے...... ایک باغ درختوں سے گھرا
ہوا۔ جن کی کاہی پتیوں پر تاروں کی چمک شبنم میں اور تارے چمکا رہی ہے۔
واہ! واہ! کیا کیا خوش نما پھل ہیں۔ آم، منہ لال کلیجہ بال ماں کا بغدو بچہ
سیب کیسے خوبصورت ہیں۔ اندھیرے اندھیرے درختوں میں سرخ اور
گلابی اور پستئی لٹکے ہوئے ہیں، ڈالیوں سمیت جھکے ہوئے ہیں۔ ارے بیر
تو دیکھو! کیسے موٹے موٹے اور عنابی ہیں، شیخوپورے[1] کے ہے۔ ایک نہر،

---

[1] دہلی کے قریب ایک قصبہ ہے۔ جہاں کے بیر مشہور ہیں۔

اندھیری رات میں چاندی کی چادر بچھی ہوئی ہے، شاید دودھ ہے۔ کہیں جنت تو نہیں ؟ ایک کشتی بڑی آہستگی سے، بطخوں کی نزاکت سے بہتی ہوئی۔ جلدی آؤ، جلدی بیٹھ جاؤ، بہشت کی سیر کرائیں، کیا بیویاں ہیں، پاک صاف، بلور جیسی گوری؟ اُجلے بُراق کپڑے، نزاکت ایسی جیسی ہوا کی۔ کشتی بہتے ہوئے چراغ کی طرح پانی پر چلی جارہی ہے۔ دونوں طرف کھُلے کھُلے میدان جو ہری ہری دُوب سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ بیچ بیچ میں پھولوں کے رنگین تختے، اور پھلوں کے درخت دکھائی دیتے ہیں۔ جانور چہچہا رہے ہیں، شور مچا رہے ہیں۔ تو کیا یہ جنت ہے؟ کیا ہم جنت میں ہیں؟ ہاں، بہشت، خدا کے نیک اور پیارے بندوں کی جگہ۔ کشتی کچھ چھوٹے چھوٹے سیپ کی طرح چمکدار اور گنبدوں کی طرح گول مکانوں کے سامنے سے گزری۔ کیا خوبصورتی اور کیسا چمک ہے! نگاہ تک نہیں ٹھہرتی۔ ٹپکتے تو نہوں گے؟ کیا ان میں مجھ کو بھی جگہ ملے گی؟ خدا کے نیک اور سچے بندوں کیلئے ہیں، پاک بندوں کیلئے۔ پیٹ میں ایک کھُرچن، کلیجہ میں ایک کچاؤ؛ انتڑیاں بل کھا رہی ہیں۔ ایسا معلوم ہوا کہ گود میں کسی نے کچھ رکھ دیا۔ یہ ایک موتی کی طرح

سفید اور سیب کی طرح بڑا پھل تھا۔ ڈنڈی میں دو ھرے ھرے پتے بھی لگے ہوئے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی ڈال سے توڑا گیا ہو۔ آہا، کیا مزہ ہے! کاش کہ اور ہوتے۔ گود بھری ہوئی تھی۔ کشتی دو پہاڑوں کے بیچ سے گزر رہی تھی۔ ایک موڑ تھا۔ تھوڑی دیر میں جب موڑ ختم ہوا تو یکایک دور کے ایک اونچے پہاڑ سے بجلی سے زیادہ تیز روشنی کی لپٹیں آگ کی طرح اٹھتی ہوئی دکھائی دینے لگیں، آنکھیں چکا چوند ہو کر بند ہوگئیں۔ اندھیرا گھُپ تھا۔ ایک شور کی آواز گرج سے بھی زیادہ تیز آنے لگی۔ صُور پھُنک رہا تھا۔ کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔ کشتی والی بیویاں اِدھر اُدھر دَوڑ رہی تھیں۔ اتنے میں پھر ایک تیز روشنی ہوئی۔ سُورج گِر رہا تھا۔ یکایک قریب ہی سے ایک ایسی آواز آئی جیسے کوئی آتش فشاں پہاڑ پھٹ رہا ہو۔ ایک زلزلہ آگیا۔ کشتی اُلٹ گئی، اور سب دریا کے اندر ڈوب رہے تھے.....

گڑ ڑ ڑ ڑا! ٹپ ٹپ کی آواز چاروں طرف سے آرہی تھی۔ اماں! اماں! ابھی کانوں میں سنسناہٹ باقی تھی۔ دل گڑ دں اچھل رہا تھا۔ کیا ہے بیٹا، کیا ہے؟ ڈر لگ رہا ہے۔ یہ آواز کاہے کی تھی؟ کچھ نہیں بیٹا گرج ہے۔

تینوں بچے چمٹے ہوئے ایک کونے میں سُکڑے پڑے تھے۔ ٹپکا ان کے لحاف تک پہنچ چکا تھا۔ مریم کی طرف کا کونا خوب بھیگ گیا تھا۔ بیچاری نے اُٹھ کر بچوں کو اور پرے سرکایا۔ اب وہ بالکل دیوار کے برابر پہنچ گئے تھے۔ یا اللہ اگر ٹپکا اسی طرح بڑھتا رہا تو اب کے بھیگنا ہی پڑیگا۔ اماں سردی لگ رہی ہے۔ صدیقہ اسکے برابر لیٹی ہوئی تھی۔ اُسنے اُس کو چمٹا کے لٹا لیا۔ رُوئی نہیں تو دُوئی ہی سہی۔ اُدھر دونوں لڑکے چٹے پڑے تھے لپٹے ہوئے۔ جیسے سانپ درخت سے لپٹ جاتا ہے۔

یا اللہ رحم کر۔ خدا غریبوں کے ساتھ ہوتا ہے، اُن کی مدد کرتا ہے، اُن کی آہ سُن لیتا ہے۔ کیا میں غریب بھی نہیں؟ خدا سُنتا کیوں نہیں؟ ہے بھی یا نہیں؟ اگر ہے کیا؟ جو کچھ بھی ہے بڑا جلاد ہے۔ اور پھر بڑا بے انصاف ہے! کوئی امیر کیوں؟ کوئی غریب کیوں؟ اس کی حکمت ہے۔ اچھی حکمت ہے کوئی جاڑے میں ٹھٹھریں، لیٹنے کو پلنگ تک نہ ہوں۔ اوڑھنے کو کپڑے تک نہ ہوں۔ سردی کھائیں، بارشیں سہیں، فاقے کریں، اور موت بھی نہ آئے۔ کوئی ہیں کہ لاکھوں والے ہیں، ہر قسم کا سامان ہے،

کسی بات کی تکلیف نہیں۔ اگر وہ تھوڑا سا ہم ہی کو دے دیں تو اُن کا کیا جائیگا؟ غریبوں کی جانیں پل جائیں گی۔ لیکن اُن کو کیا پڑی۔ کس کی بکری اور کون ڈالے گھاس۔ ہم کو بنایا کس نے؟ اللہ نے؟ تو پھر ہماری پروا کیوں نہیں کرتا؟ کس لیے بنایا؟ رنج سہنے اور مصیبت اُٹھانے کیلئے؟ ارے کیا انصاف ہے! وہ کیوں امیر ہیں، ہم کیوں نہیں؟ عاقبت میں اس کا بدلہ لے گا۔ مولوی تو یہ ہی کہتے ہیں، عاقبت کس کی، بھاڑ میں جائے عاقبت، تکلیف تو اب ہے، ضرورت تو اب ہے، بُخار تو اس وقت چڑھا ہوا ہو، اور دوا دس برس بعد ملیگی؟ بعض آئے ایسی عاقبت سے۔ جب کی جب بھگت لیتے، اب تو کچھ ہو۔ خدا؟ محض ایک بہانہ، محض ایک ڈھوکا ہے۔ غربت میں غریب رہنے کی تسلی، مایوسی میں مایوس اُمید، مصیبت میں تکلیف سے قانع رہنے کا ذریعہ۔ خدا؟ صرف ایک دھوکے کی ٹٹی۔ اور مذہب کہ وہ بھی یہی سکھاتا ہے، یہ ہی پڑھاتا ہے، پھر کہتے ہیں کہ علم کا خزانہ ہے۔ اور پھر افلاس کا بہانہ ہے" بیوقوفوں کی عقل ہے، آگے بڑھتے ہوؤں، اوپر چڑھتے ہوؤں کو پیچھے کھینچتا ہے، ترقی کے راستہ میں ایک رُکاوٹ ہے۔ غریب رہو، غربت

ہی میں خُدا ملتا ہے۔ ہم نے تو پایا نہیں۔ امیروں سے کیوں نہیں روپیہ دلوا دیتا؟ دولت کا کیا ہوگا، صرف اتنا چاہئے کہ اوقات بسر ہو جائے۔ آخر امیر ہی دولت کا کیا کرتے ہیں؟ تہ خانوں میں پڑی زنگ کھاتی ہے۔ کسی خرچ کا بھی ٹھیک نہیں، جو بے تکے پن سے اُٹھتا ہے، لُٹتا ہے۔ سرکار ہی کچھ کیوں نہیں کرتی؟ اور نہیں تو سب کو برابر روپیہ دلوا دے اور اگر اتنا نہیں تو صرف آدھا ہی ہم کو ملجائے۔ لیکن سرکار کی جوتی کو کیا غرض پڑی جو اپنی جان ہلکان کرے۔ اُسکے تو خزانے پُر ہیں، بیٹھے ٹھلائے روپیہ ملجاتا ہے۔ اُس کو کیا، موت تو ہماری ہے جب پڑے تو جانے، اونٹ جب پہاڑ کے نیچے آتا ہے تو بلبلاتا ہے۔ ابھی تو......

اُمّاں! ہاں بیٹا کیا ہے؟ آماں بُھوک لگی ہے۔ بُھوک! مریم کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی، یا الٰہی کیا کروں! ہا۔ بیچارے بچّے! میاں یہ بھی کوئی بُھوک کا وقت ہے؟ بُھوک نہ ہوئی دیوانی ہو گئی، سُو جاؤ، صُبح ہوتے کھانا۔ نہیں آماں میں تو ابھی کھاؤنگا بڑے زور کی بھوک لگی ہے۔ نہیں بیٹا یہ کوئی وقت نہیں لیٹ جاؤ۔ وہ دیکھو کڑک ہوئی۔ بچہ بچارہ کڑک کی آواز

سُنتے ہی سہم کر لیٹ گیا۔ کہاں سے لاؤں؟ کیا کروں؟ بارش نے تو دن بھر نکلنے بھی نہ دیا کہ کسی کے ہاں جاتی اور تھوڑا بہت جو کچھ ملسکتا لا کر سیتی۔ بیچاری فیاض بیگم کے ہاں بھی جانا نہ ہوا، وہ ہی بیچاری بچا کُھچا جو کچھ ہوتا ہے برابر دیدیتی ہیں۔ اب جو اگر کل بھی کہیں سے کام نہ ملا تو کیا ہوگا؟ آخر کہاں تک مانگ مانگ کے لاؤں؟ دیتے دیتے بھی لوگ اُکتا جاتے ہونگے۔

آماں، بھوک لگی ہے۔ دیکھو تو پیٹ خالی پڑا ہے۔ کل دن سے نہیں کھایا اور نیند بالکل نہیں آتی۔ کلیجہ مُنہ کو آرہا تھا۔ بیچاری آخر کو اُٹھی اور دیوے کی مدہم روشنی میں ٹٹولتی ہوئی صندوق کی طرف گئی کہ اگر کچھ مل جائے تو بچّے کو دے۔ آخر تو صرف پانچ برس کی جان ہے! کاش میں نے ان بچوں کو جنا ہی نہ ہوتا، میں تو مر گر کے کاٹ ہی لیتی، لیکن انکی تکلیف تو دیکھی نہیں جاتی۔ ایک سُوکھی ہوئی روٹی ایک ہنڈیا میں پڑی پا گئی۔ اُس کو توڑ کر پانی میں بھگویا اور بچّے کے سامنے لا رکھی۔ پیٹ بُری بُری بلا ہے۔ بیچارا کُتّے کی طرح چٹ گیا، تھوڑی کھانے کے بعد بولا، آماں ذرا سا گڑ ہو تو دیدو۔ مریم پھر کھڑی ہو گئی کہ شاید گڑ کی ڈلی بھی مل جائے۔ اتفاق سے

ایک چھوٹی سی ڈلی پاگئی۔ بچے نے جو کچھ ہوسکا کھایا۔ دوچار نوالے جو بچے تھے مریم اپنے آپ کو ضبط نہ کرسکی اور تھوڑا تھوڑا کرکے کھاگئی۔...

کڑک اور چمک رُک چکی تھی۔ بارش بھی کم ہوگئی تھی۔ پھر صدیقہ سے چمٹ کے لیٹ گئی اور اکیلی تھی۔

آہ! کاش کہ وہ ہوتے! آہ وہ ہوتے۔ وہ، وہ، وہ۔ رات کو آکے کچھ نہ کچھ لئے چلے آتے ہیں۔ کیا لائے ہو؟ حلوا سوہن ہے۔ وہ ہی نگوڑا پیڑی کا ہوگا۔ تم جانتے ہو کہ مجھے حبشی پسند ہے۔ لو! پھر جھینپنے لگیں دیکھا تو ہوتا۔ آہ! وہ جھگڑے اور وہ ملاپ، ساون اور بھادوں کے ملاپ۔ کیا دن تھے۔ اب تو ایک خواب ہیں۔ پھر چاندنی راتوں میں پھول والوں کی سیر۔ آہ! وہ سیجیں۔ کیا مہک تھی دماغ پھٹا جاتا تھا، اور اب تو وہ باسی پھول بھی نہیں، مرجھائے ہوئے پھول بھی نہیں، اے کاش وہ ہوتے۔ وہ ٹانگیں، ایک سبز درخت گوشت اور ہڈی اور گودے کا۔ اُس کا رس خون سے زیادہ گرم، اور اُس کی کھال گوشت سے زیادہ نرم۔ ایک تنا ٹیک اور مضبوط، اور دو ڈالیں؛ اور دو ڈالیں اور ایک تنا، ایک دوسرے میں پیوند، ایک دوسرے سے چمٹی

ہوئی، ایک دوسرے میں ایک دوسرے کی روح، جڑی ہوئی، بل کھائی ہوئی، ایک دوسرے کی جان، اور ایک دوسرے میں ایک تیسری روح کی اُمید، ایک پوری زندگی کا خزانہ؛ ایک لمحہ کا سرمایہ، پرنیستی میں ہستی کی طاقت۔ آہ! وہ ٹانگیں، دو ناگ بل کھائے ہوئے اُوس سے بھیگی ہوئی گھاس پر مست پڑے ہیں۔ ایک سُوئی کے ناکے میں تاگا اور دو انگلیاں، تیز تیز چلتی ہوئی، سیاٹے بھرتی ہوئی، نرم نرم روئیں دار مخمل پر گلکاریاں کر رہی ہیں۔ ایک مکڑی اپنی جگہ قائم جالا بُن رہی ہے، اوپر نیچے ہل رہی ہے، کچھ خبر نہیں کہ مکھی جال میں پھنس چکی ہے؛ اور کھاب کہ تار بنا جاتا ہے، جال بنا جاتا ہے۔ ایک ڈول کوئے کی گہرائی میں لٹکا ہوا، تہ تک پہنچا ہوا، اُسکے ملائم ریت کی گرمی محسوس کر رہا ہے: پانی کی سطح پر چھوٹے چھوٹے دائرے جو بڑھتے بڑھتے سارے میں پھیل گئے، دیواروں سے ٹکرانے لگے، باہر جانے لگے، اندر واپس آنے لگے، ایک سنسنی اور حرارت سارے میں پھیلا ہے ہیں۔ دو جڑواں درخت، ایک پیپل اور ایک آم، ایک ہی جڑ میں اُگے ہوئے، ایک ہی تنے سے پیدا، ایک ہی زندگی کے ہمراز، تھے کہ اگ رہے

تھے۔ ایک دوسرے کا سہارا، ایک دوسرے کی تسلی، ایک ہی ہوا میں سانس لیتے، ایک ہی سُوت کے پانی سے جیتے تھے۔ آہ! وہ جسم۔ اور اب تو پیپل کو بجلی نے جلا ڈالا، جڑ سے بھسم ڈالا! مگر آم ہے کہ قسمت کا مارا ابھی تک کھڑا ہے۔ کاش کہ اس پر بجلی گری ہوتی ــــ گنجا۔ اکیلا، مُرجھایا ہوا، بچھڑی کی جان ابھی تک ٹھوکریں کھانے کو زندہ ہے۔ اگر وہ ہوتے۔۔۔۔

لحاف میں ایک حرکت، صدیقہ نے ایک کروٹ لی۔

آہ! زمانہ کسی کے بہلاوے میں نہیں آتا، کسی کے پھسلاوے میں نہیں آتا۔ اور میں ایک اکیلی ہوں، آہ! میں اکیلی ہوں۔ اس سے تو زندگی کا لطف دیکھا ہی نہ ہوتا جو آج یہ تنہائی محسوس نہ ہوتی۔ میرے دل میں کوئی جگہ خالی نہ ہوتی، محبت کی جگہ۔ اُمید بھی کیا جھوٹے جھلاتی ہے۔ کبھی پاس آتی ہے۔ کبھی دُور جاتی ہے۔ لیکن اُمید کا ہے کی؟ اب تو ایک مایوسی ہے کہ سارے میں پھیلی ہوئی ہے، بادلوں کی طرح اُمڈی ہوئی ہے۔ وہ سُوت کی رسّی کا جھولا، چار ہم جولیاں، ٹھیکرے کے ایک ایک کنارے پر دو دو۔ اور پینگ ہیں کہ درخت کو ہلائے ڈالتے ہیں، گھنگھور گھٹاؤں میں گھسے جاتے ہیں۔

جھولا کن نے ڈالورے آموریاں۔ واہ! انوری اور کشور، بس اتنے ہی پینگ لے سکتی ہو؟ دیکھو میں اور کبرے کتنا بڑھاتے ہیں۔ چکّر نہ آ جائیں جب ہی کہنا ۔۔۔۔۔۔ پھر ایک ہنسی کا غل، اور پھر ایک قہقہوں کا شور۔۔۔۔۔۔۔۔۔ آہ! اب تو زندگی ایک ہوا ہے۔ باغ ارم اور حوروں کی خوش فعلیاں، پھولوں کے ہار اور اوس کا جھومر۔ نہ وہ بیر کی ڈالی! کہاں میرا آشیانہ؟ پھر ایک تپتی ہوئی چٹان، بنجر اور سخت، اور اس کے پہلو سے زندگی۔ لیکن پھر ایک نئی ہستی، پھر ایک نئی آن، من و سلوے کے مزے، دُودھ کی شیریں نہروں میں نہانا، اور اُن میں کھیلنا۔ پھر دن عید، رات شب برات۔ لیکن آہ! زمانہ کی ایک کروٹ ــــ ابلیس اور گیہوں اور نیستی۔ تنہائی، تنہائی، ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا کاش کہ وہ ہوتے ــــ اے آدم! ــــ نہ پھر اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں۔ پھر وہی خوشی اور خرمی۔ ایک قیامت بپا ہے۔ نفسی نفسی کا عالم، اسرافیل کا شور، دجّال ہے کہ سب کو پھسلا رہا ہے۔ میں تو اس کے پاس جاؤنگی، اُمید تو ہے۔ آہ! یہ تنہائی۔ کوئی سر پہ ہاتھ رکھنے والا بھی نہیں۔ ٭

تسلّی نہ تشفی نہ دلاسا۔ تنہائی، تنہائی۔ رات اندھیری اور بھیانک رات،
ارے لا دو کوئی جنگل مجھے .... جنگل .... مجھے .... بازا
.... با۔ زار۔ مُوُو۔ اُدجھ ....

رات

دلّی کی سَیر

"اچھی بہن ہمیں بھی تو آنے دو" یہ آواز دالان میں سے آئی، اور ساتھ ہی ایک لڑکی کُرتے کے دامن سے ہاتھ پونچھتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ ملکہ بیگم ہی پہلی تھیں جو اپنی سب ملنے والیوں میں پہلے پہل رَیل میں بیٹھی تھیں۔ اور وہ بھی فرید آباد سے چلکر دلی ایک روز کیلیے آئی تھیں۔ محلہ والیاں تک اونکی داستانِ سفر سُننے کیلیے موجود تھیں۔ "لے ہے آنا ہے تو آؤ! میرا منہ تو بالکل تھک گیا۔ اللہ جھوٹ نہ بُلوائے تو سینکڑوں ہی بار تو سُنا چکی ہوں۔ یہاں سے رَیل میں بیٹھ کر دلّی پہونچی اور وہاں اُن کے ملنے والے کوئی نگوڑے اسٹیشن ماسٹر مل گئے۔ مجھے اسباب پاس چھوڑ یہ رفو چکّر ہوئے اور میں اسباب پر چڑھی برقعہ میں لپٹی بیٹھی رہی۔ ایک تو کمبخت برقعہ، دوسرے مُردُوے۔ مَرد تو ویسے ہی خراب ہوتے ہیں، اور اگر کسی عورت

کو اس طرح بیٹھے دیکھ لیں تو اور چیخ پر چیخ لگاتے ہیں۔ پان کھانے تک کی نوبت نہ آئی۔ کوئی کمبخت کھانسے، کوئی آوازے کسے، اور میرا ڈر کے مارے دم نکلا جائے۔ اور بھوک وہ غضب کی لگی ہوئی کہ خدا کی پناہ! دلی کا اسٹیشن کیا ہے بڑا قلعہ بھی اتنی بڑا نہ ہوگا۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی اسٹیشن ہی اسٹیشن نظر آتا تھا، اور ریل کی پٹریاں، انجن، اور مال گاڑیاں۔ سب سے زیادہ ڈر مجھے اُن کالے کالے مُردوں سے ڈر لگا جو انجن میں رہتے ہیں۔

"انجن میں کون رہتے ہیں؟" کسی نے بات کاٹ کر پوچھا۔

"کون رہتے ہیں؟ نہ معلوم بوا کون! نیلے نیلے کپڑے پہنے، کوئی داڑھی والا، کوئی صفاچٹ۔ ایک ہاتھ سے پکڑ کر چلتے انجن میں لٹک جاتے ہیں۔ دیکھنے والوں کا دل سَن سَن کرنے لگتا ہے۔ صاحب اور میم صاحب تو بوا دِلی اسٹیشن پر اتنے ہوتے ہیں کہ گِنے نہیں جاتے۔ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گٹ پٹ کرتے چلے جاتے ہیں۔ ہمارے ہندوستانی بھائی بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تکتے رہتے ہیں۔ کمبختوں کی آنکھیں نہیں پھوٹ جاتیں۔ ایک میرے سے کہنے لگا "ذرا منہ بھی دکھا دو۔ میں نے ذرا......"

"تو تم نے کیا نہیں دکھایا" کسی نے چھیڑا۔

"اللہ اللہ کرو بوا۔ میں اِن موؤں کو مُنہ دکھانے گئی تھی۔ دِل بلیوں اچھلنے لگا۔" تیور بدل کر "سُننا ہے تو بیچ میں نہ ٹوکو۔" ایک دم خاموشی چھاگئی۔ ایسی مزیدار باتیں فریدآباد میں کم ہوتی تھیں۔ اور ملکہ کی باتیں سُننے تو عورتیں دُور دُور سے آتی تھیں۔ "ہاں بوا سودے والے ایسے نہیں جیسے ہمارے ہاں ہوتے ہیں۔ صاف صاف خاکی کپڑے اور کوئی سفید لیکن دھوتیاں کسی کسی کی میلی تھیں۔ ٹوکرے لیے پھرتے ہیں۔ "پان بیڑی سگریٹ، دہی بڑے، کھلونا ہے کھلونا" اور مٹھائیاں چلتی ہوئی گاڑیوں میں بند کیے بھاگے پھرتے ہیں۔ ایک گاڑی آکر رُکی۔ وہ شور غل ہوا کہ کانوں کے پردے پھٹے جاتے تھے۔ اِدھر قلیوں کی چیخ پکار اُدھر سودے والے کان کھائے جاتے ہیں۔ مُسافر ہیں کہ ایک دوسرے پر پلے پڑتے ہیں اور میں بچاری بیچ میں اسباب پر چڑھی ہوئی۔ ہزاروں ہی کی تو ٹھوکریں اور دھکے کھائے ہوں گے۔ بھئی جل تو جلال تو آئی بلا

کوٹال تو، گھبرا گھبرا کر پڑھ رہی تھی۔ خدا خدا کرکے ریل چلی تو مسافر اور قلیوں میں لڑائی شروع ہوئی: "ایک روپیہ لونگا"، "نہیں دو آنہ ملینگے"۔ ایک گھنٹہ جھگڑا ہوا جب کہیں اسٹیشن خالی ہوا۔ خالی کیا ہوا اسٹیشن کے شہدے تو جمع ہی رہے۔ کوئی دو گھنٹہ کے بعد یہ مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے دکھائی دیے۔ اور کس لاپرواہی سے کہتے ہیں "بھوک لگی ہو تو کچھ پوریاں کچوریاں لادوں۔ کھاؤگی؟ میں تو اُدھر ہوٹل میں کھا آیا"۔ میں نے کہا کہ "خدا کیلئے مجھے میرے گھر پہونچادو۔ میں باز آئی اس موئی دلی کی سیر۔ تمہارے ساتھ تو کوئی جنت میں بھی نہ جائے اچھی سیر کرانے لائے تھے"۔ فرید آباد کی گاڑی تیار تھی اُس میں مجھے بٹھا اور منہ پھُلا لیا کہ "تمہاری مرضی، سیر نہیں کرتیں تو نہ کرو!"

——·——

پردے کے پیچھے

——·——

(ایک ایکٹ کا ڈرامہ)

ایک کمرہ ہے جس میں سفید فرش بچھا ہے اور کمرے کے بیچ میں ایک سوزنی بچھی ہے اُس پر گاؤ تکیے سے لگی ایک بیوی بیٹھی ہیں جو رنجیدہ اور تھکی ہوئی سلام ہوتی ہیں۔ اُن کے قریب ایک چھوٹی سی صراحی، کٹورے سے ڈھکی ہوئی، تانبے کی طشتری میں رکھی ہوئی ہے۔ اُن کے مقابل ایک دوسری بیوی بیٹھی ہیں جو چالیس کے قریب عمر کی ہیں اور چھالیہ کترنے میں کاٹ رہی ہیں۔ ایک طرف اُن کی پٹاری رکھی ہے اور دوسری طرف اُگالدان۔ کمرے میں دو دروازے سامنے ہیں اور باقی جگہوں میں طاق اور الماریاں ہیں جس میں برتن اور سرپوش چنے ہیں۔ وسط میں چھت پر سے پنکھا ٹنگا ہوا ہے جس پر گلابی جھالر لگی ہے . . . . کمرے کے ایک کونے میں پلنگ۔ اُس پر پلنگ پوش پڑا ہوا ہے۔ دوسری طرف ایک اور سوزنی بچھی ہے گاؤ تکیہ لگا ہے اور اُگالدان رکھا ہے۔

———

محمدی بیگم: لے ہے آپا ہمارا کیا ہے۔ اتنی گزر گئی، جو باقی ہے وہ بھی خدا کسی نہ کسی طرح گزار دیگا۔ میرا دل تو دُنیا سے اب ایسا اُکتا گیا ہے، اگر ان چھوٹے بچوں کا خیال نہ ہوتا تو خدا کی قسم میں تو زہر کھالیتی۔

آفتاب بیگم: دیوانی ہوئی ہو بوا۔ اچھی ابھی تمھاری عمر ہی کیا ہے جو زہر کھانے لگیں! اب تو تمھارے بہار دیکھنے کے دن آئے ہیں بچے ماشاءاللہ اب بڑے ہو رہے ہیں۔ اب چلی ہیں زہر کھانے۔ مجھے دیکھو.....

محمدی: تمھیں کیا دیکھوں، کوئی عمر کی بات ہے۔ کوئی بڈھے ہی دنیا سے تنگ آتے ہیں! ہم نے تو جتنی زندگی کی ہوس بڈھوں میں دیکھی اتنی جوانوں میں نہ دیکھی۔ ساری دُنیا مری جا رہی ہے، نہ معلوم ہماری موت کہاں جاکر سو رہی۔ بچے وچے سب بھول جاتے ہیں اور تھوڑے دن میں سب ٹھیک......

آفتاب: ہوش میں آؤ کچھ ہوش ہیں! ابھی تمھاری عمر ہی کیا جو مرنے کی فکر سوار ہے۔ میرے سے تو تم دس بارہ برس چھوٹی ہو۔ میرے بیاہ کی باتیں ہو رہی تھیں جس برس تم پیدا ہوئی ہو۔ اُس سال

لکھ مری تھی۔ مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے، اللہ بخشے چچی اماں کتنی خوش تھیں۔ میرے لیئے تو بیٹا ہی ہے۔ چچی اماں کے بیاہ کے تیس برس بعد کہیں تم پیدا ہوئیں تھیں۔ کھانا، ناچ رنگ اور کیا کیا ڈومنیاں آئی ہیں۔ اور تو اور، تمہارا بیاہ بھی کس ارمانوں سے ہوا ہے۔ ساری دلّی واہ واہ بول گئی تھی۔ تمہارے برابر کون خوش قسمت ہوگا۔ مجھ دکھیا کی طرف دیکھو۔ تمہارے تو اللہ رکھے میاں، بچے، گھر، سب ہی کچھ ہے۔

محمدی: ہاں ٹھیک ہے! میاں، بچے، گھر، سب ہی کچھ ہے۔ جوانی کون مجھے جوان کہے گا؟ ستّر برس کی بڑھیا معلوم ہوتی ہوں۔ روز روز کی بیماری، روز روز کے حکیم ڈاکٹر، اور ہر سال بچے جننے! ہاں مجھ سے زیادہ کون خوش قسمت ہوگا!

یہ کہہ کر آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ رومال سے آنسو پونچھکر اور اُگالدان میں تھوک کر پھر شروع کیا۔

ابھی دو مہینے کی بات ہے پچھلا حمل گرنے سے پہلے کا ذکر ہے کہ ڈاکٹرنی

کو بلانے کی صلاح ہوئی۔ ڈاکٹر غیاث نے بھی یہی کہا کہ اندرونی خرابی کی وجہ سے روز روز بخار نہ رہتا ہو، بہتر ہے کہ ڈاکٹرنی اندر سے دیکھ لے۔ لو عمر کی بات سنو۔ ڈاکٹرنی نے مجھ سے میری عمر پوچھی۔ میں نے کہا، ۲۳ سال۔ کچھ اس طرز سے مسکرائی جیسے کہ یقین نہ آیا۔ میں نے کہا کہ مس صاحب، آپ مسکراتی کیا ہیں! آپ کو معلوم ہو کہ ۱۷ سال کی عمر میں میری شادی ہوئی تھی اور جب سے ہر سال میرے ہاں بچہ ہوتا ہے۔ سوائے ایک تو جب میرے میاں سال بھر کو ولایت گئے تھے اور دوسرے جب میری اُنکی لڑائی ہو گئی تھی۔ اور یہ دانت جو آپ غائب دیکھ رہی ہیں یہ ڈاکٹر غیاث نے اکھاڑ ڈالے۔ پایوریا نہ معلوم کون بیماری ہوتی ہے وہ تھی۔ ساری بات یہ تھی کہ ہمارے میاں جو ولایت سے آئے تو اُن کو ہمارے مُنہ میں سے بُو آتی تھی۔ وہ بچاری خوب ہنسی۔

آفتاب: تم باتیں ہی ایسی کرتی ہو کہ سُننے والے ہنسے نہ تو کیا کرے۔

محمدی: خیر اُس بچاری نے سینہ دیکھا۔ پیٹ دیکھا۔ جب اندر سے

دیکھا تو گھبرا کر کہنے لگی، بیگم صاحب آپ کے تو پھر دو ماہ کا حمل معلوم ہوتا ہے۔ میرا تو دل سن سے ہو گیا کہ لو اور آفت آئی۔

اتنے میں بچوں کے رونے کی آواز دوسرے کمرے سے آئی۔ اور لوگوں کی کی چیخ پکار دوسرے کمرے میں سے سُنائی دی۔ بیگم صاحبہ گاؤ تکیہ سے اُٹھ بیٹھیں اور چیخ کر۔

ارے کمبختوں نہ دو منٹ سونے کا آرام نہ بات کرنے کی مہلت۔ اتنی حرام زادیاں بھر رہی ہیں پھر بھی بچے ہیں کہ شور مچائے جاتے ہیں۔ اس سے تو خدا مجھے ہی غارت کر دے کہ دُنیا کے وبال سے چھٹوں۔

کمرے کا دروازہ کھلا۔ دو انائیں۔ صاف کپڑے، سُوسی کے پاجامے، ململ کے کرتے دوپٹے، دو بچوں کو روتا ہوا لئے کر داخل ہوئیں۔ کچھ اور بچے پیچھے بڑے دروازے میں سے کھڑے ہوئے نظر آئے۔ یہ سب بچے دُبلے اور زرد اور کمزور تھے۔ دروازے میں سے چبوترا اور صحن نظر آتا ہے۔

ایک انّا: بیگم صاحب یہ بڑے ننّھے میاں نہیں مانتے۔ جب کمرے میں آتے ہیں بچوں کو ستاتے ہیں کھیلنے نہیں دیتے۔ اب ننّھی بی کی گڑیا اور چھوٹے میاں کی گیند لے کر بھاگ گئے اور سیدھے مردانے میں چلے گئے کئی بار.....

محمدی: (طیش کھاکر) قصائی ہے نگوڑا قصائی! گھر میں کسی کو چین نہیں لینے دیتا۔ آخر کس باپ کا بیٹا ہے۔

بچے کو گود میں لے کر پیار کیا۔ پٹاری میں سے کچھ نکال کر دونوں بچوں کو کھانے کو دیا اور اسکے بعد اُنا کو واپس کر دیتی ہیں۔

جاؤ خدا کیلئے اب سدھارو۔ صبح سے شام تک چیخ پکار!

بھر ٹھہر کر، جب نوکریں کواڑ کھلا چھوڑ دیتی ہیں

ارے کواڑ تو بند کر دو! صبح سے کئی دفعہ کہہ چکی ہوں جب اِدھر سے نکلیں گی کواڑ کھلا چھوڑ جائیں گی!

آفتاب: بوا! تمہارے گھر میں ماشاء اللہ ہر وقت تو مُوا ڈاکٹر کھڑا رہتا ہے پھر بھی بچے دیکھو دُبلے، زرد، کمبخت، حقیر۔ فاقوں کے ملے معلوم ہوتے ہیں۔

محمدی: اے آپ ہی ہونگے، جن کو ماں کا دُودھ نصیب نہ ہو! انائیں جیسی کانی، کھُدری، موٹی تپلی، مل گئیں رکھ لی گئیں۔ میاں کا حکم ہے کہ جب خدا نے روپیہ دیا ہے تو تم کیوں تکلیف اُٹھاؤ۔

سارا مزا اپنے نفس کا ہے، کہ بچہ میرے پاس رہیگا تو خود کو تکلیف ہوگی۔ نہ رات دیکھیں نہ دن بس ہر وقت بیوی چاہیئے اور بیوی پر ہی کیا ہے، اِدھر اُدھر جانے میں کون سے کم ہیں!

آفتاب: محمدی بیگم تم تو ہر بات میں بچارے اپنے میاں ہی کو قصوروار ٹھہراتی ہو۔ اُنا رکھے تو وہ بُرا نہ رکھتا تو وہ بُرا ہوتا۔ بُوا اللہ اللہ کرو!

محمدی: اے ہے آپا تم یہاں نہیں تھیں جب نصیر مرا ہے۔ چار مہینے کی جان جو تکلیف اُس پر گزری ہے وہ خدا دشمن پر بھی نہ ڈالے۔ غیروں سے نہ دیکھی جاتی تھی۔ اُس کی اُنا تھی تو خاصی ہٹی کٹی۔ دیکھنے میں تندرست لیکن گرمی کی بیماری تھی۔ اب اس کی کس کو خبر تھی۔ بچہ پھوٹ نکلا۔ یہ بڑے بڑے آبلے بدن پر پڑ گئے۔ اور جب وہ پھوٹیں تو کچا کچا گوشت نکل پڑے۔ جوڑ جوڑ میں پیپ پڑ گئی، تسلے بھر بھر کے انھیں ڈاکٹر غیاث نے نکالی۔ میں پردے کے پیچھے سے دیکھتی، دم نہ مارو شگرگزار و، کی مثل ہے۔ غرضکہ اسی طرح دو مہینے سڑ سڑ کر بچہ رخصت ہوا۔ اسکے بعد تین بچے ہوے ہیں۔ کتنی مُصر ہوئی کہ میں خود دُودھ

پلاؤنگی۔ لیکن سنتا کروں ہے، دھمکی یہ ہے کہ دُودھ پلاؤگی تو میں اور
بیاہ کرونگا۔ مجھے ہر وقت عورت چاہیئے میں اتنا صبر نہیں کر سکتا
کہ تم بچوں کی ٹِلّے نویسی کرو۔ اور پھر تم کہتی ہو ......

آفتاب: اے ہے تو یہ بات ہے! مجھے کیا معلوم۔ خدا ایسے مردوں
سے بھی بچائے۔ جانور بھی تو کچھ خوف کرتے ہیں، یہ تو جانوروں
سے بھی بدتر ہو گئے۔ ایسے مردوں کے پالے تو کوئی نہ پڑے ایسی
باتیں بُوا پہلے نہ تھیں۔ اب جس مردوے کو سُنو کمبخت کو یہی
آفت ہے۔ اب تمھارے بہنوئی ہیں، خیر اب تو بڑھاپا ہے کبھی جوانی
میں بھی زیادتی نہیں کی۔ (مسکرا کر) خدا کی قسم پہروں ناک
رگڑواتی تھی۔

محمدی: (ٹھنڈا سانس لے کر) اپنی اپنی قسمت ہے۔ تمھاری اس بات
پر یاد آیا کہ وہ ڈاکٹرنی والی بات پوری نہیں ہوئی۔ بات کہاں کی
کہاں جا پہونچتی ہے۔ جب ڈاکٹرنی نے کہا کہ میرے دو مہینہ
کا پیٹ ہے، تو نہایت تعجب سے میری طرف دیکھ کر کہنے لگی، کہ

بیگم صاحب! آپ تو کہہ رہی تھیں کہ چار مہینے سے آپ پلنگ پر پڑی
ہیں، روز شام کو بخار آتا ہے، اور ڈاکٹر غیاث بھی یہی کہہ رہے
تھے کہ روز شام کو ۱۰۰ یا ۱۰۱ پر بخار ہو جاتا ہے۔ تو آپ کا مطلب ہے
کہ پھر آپ کے ...... میں نے کہا، کہ اے مس صاحب! تم
ہی بھلی ہو۔ کماتی ہو، کھاتی ہو، مزے کی نیند سوتی ہو۔ یہاں
تو مُردہ جنت میں جائے یا دوزخ میں، اپنے حلوے مانڈے سے
کام ہے۔ بیوی نگوڑی چاہے اچھی ہو چاہے مر رہی ہو، مردوں
کو اپنے نفس سے کام ہے۔ وہ بچاری سُن کر چُپ ہو گئی۔ کہنے
لگی، کہ آپ اتنی بیمار ہیں۔ اور بوا وہ بچاری کیا سب ہی ڈاکٹر
یہ کہتے ہیں کہ آپ کے بچے کس طرح موٹے تندرست ہوں، جب
ایک تو آپ خود اتنی کمزور دوسرے بچے اتنی جلدی جلدی ہوتے
ہیں۔ کیا کیا جائے اس سے کرشاں ہوتے تو بھلے تھے۔

آفتاب: توبہ کرو توبہ، کفر نہ بکو! خدا ان کافروں کو غارت کرے! ایک بیٹا
ہے وہ بھی ایک کرشان کر بیٹھا ہے۔ مجھے اُس کے بیاہ کے کیا کیا

ارمان تھے۔ ابّو بھائی نے تنگ آکر وحیدہ کی منگنی کر دی۔ ہائے میرے دل پر کیا کیا سانپ لوٹے ہیں کہ میری بچپن کی مانگ غیر کے گھر جائے۔ اس سے تو وہ ناشدنی نہ ہوا ہوتا اور میرے لیے تو مر گیا۔

محمدی: کس دل سے کوستی ہو! بڑھاپے کا سہارا ہے کبھی تو ٹھیک ہوگا۔

آفتاب: اے وہ کیا ٹھیک ہوگا! دو برس ہوگئے صورت دیکھنے کو ترس گئی۔ شہر کے شہر میں رہتا ہے کبھی آکر جھانکتا بھی نہیں، اب تو سُنا ہے کہ ڈیڑھ سو ملنے لگے ہیں۔ اور خدا کا یہی شکر ہے کہ اولاد ہی ابھی تک نہ ہوئی۔ میں تو یہی دعا مانگتی ہوں کہ آفتاب بندی چاہے تیری قبر پر چراغ جلانے والا نہ ہو، لیکن اُس حرامزادی، جوانا مرگ، عیسائنی کے تو بچہ نہ ہو۔ ہائے بوا کس سے اپنا درد کہیے سب اپنی اپنی مصیبتوں میں مبتلا ہیں۔ محمدی بیگم! تم نے کچھ اور بھی سُنا، مرزا مقبول علیشاہ نے اور بیاہ کر لیا۔ دو دو بیویاں مر چکیں، پوتیاں نواسیاں تک بچے والیاں ہوگئیں۔ اور یہ نئی بیوی

بھی کیا بھولی بھالی شکل کی ہے۔ جوان ہے، بالکل جوان، مشکل سے کوئی بیس برس کی ہوگی۔ کمبخت کی قسمت پھوٹ گئی۔ ابھی تو بچاری کے چھ کنواری بہنیں اور بیٹھی ہیں۔ جب ہی تو بچارے ماں باپوں نے . . . . .

اتنے میں بڑے صاحبزادے، کوئی ۱۲ سال کی عمر، مٹی میں پاجامے کی مہریاں بھری ہوئی، دوسرے کواڑ کھول کر بھاگتے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔ ایک ہاتھ میں ریل دوسرے میں قینچی اور ان کے پیچھے پیچھے ایک تندرست لڑکی تنگ پاجامہ میں اور بھیگے کپڑے، دوپٹہ لٹکتا ہوا داخل ہوتی ہے۔

لڑکی: دیکھ لیجیے اماں! یہ بڑے مرزا نہیں مانتے! یہ دیکھیے میرا نیا پاجامہ کاٹ دیا۔ یہ کہہ کر کرتا اُٹھا کر دکھاتی ہے

میں اِن سے بات بھی نہیں کر رہی تھی چپکی بیٹھی ابا جان کی اچکن میں بٹن ٹانک رہی تھی۔ اور دیکھیے یہ دوپٹہ کا آنچل بھی پھاڑ دیا۔

دیوار سے لگ کھیا کر رونے لگی۔ لڑکا بہن کی نقلیں اُتارتے ہوئے۔

لڑکا: اوں، اوں اوں۔ اپنی نہیں کہتیں! ہاں تم سی رہی تھیں؟ کہہ دوں اماں سے واہیات کتابیں پڑھ رہی تھیں۔ " دلدار یار

بانکا چھیلا"! میں نے ٹھیک سے نہیں دیکھا کیا تھا۔

لڑکی: (نوذ اُمڑکر) خدا کیلیے اتنا جھوٹ نہ بولا کرو، خدا کی قسم اماں!
میں مولوی اشرف علی صاحب کا "بہشتی زیور" پڑھ رہی تھی۔ میرے
پیچھے پڑ گئے کہ دکھاؤ، جب میں نے نہیں دکھایا تو میرا پاجامہ کاٹ
دیا۔ آپ بھی انھیں کچھ نہیں کہتیں۔

محمدی: (ماتھا پیٹ کر)۔ شابش ہے بیٹی شابش! اماں مریں یا
جئیں، ہاتھ بٹانے سے تو رہیں، اور چھوٹے بہن بھائیوں سے
لڑتی ہو۔ (اور بیٹے کی طرف مڑکر) یہ موذی تو سارے دن کسی
نہ کسی کو دق کرتا رہتا ہے۔ دفع ہو یہاں سے!

آفتاب: لاؤ میاں مجھے قینچی دیدو۔ دیکھو اپنی آپا کو کون دق کرتا ہے۔ وہ
بچاری کے دن کیلیے تمھارے پاس ہے۔ اب برس دو برس میں
بیاہ ہو کر سسرال چلی جائیگی تو پھر صورت دیکھنے کو ترس جاوگے۔

صابرہ نے اس جملہ پر ذرا شرما کر سر جھکا لیا اور چپکے سے کھسک جاتی ہے۔ بڑے مرزا
کا ڈ دیکھ کر گھوڑا بنا کر بیٹھ جاتے ہیں اور چند لمحہ ٹھہر کر کودنے لگتے ہیں۔

لڑکا: تو پھر یہ ہمیں کتاب کیوں نہیں دکھاتی تھیں!

محمدی: اے ہے بڑے مرزا خدا کیلیے رحم کرو، اور اس طرح مجھکو نہ ہلا ڈالو۔
سارا جسم ہلا دیا۔ کمبخت دھڑکن ہونے لگی۔ خدا کیلیے جاؤ باہر۔
جاؤ اپنے ابا کے پاس اور مولوی صاحب آتے ہونگے۔ سبق یاد
کرلیا؟

سبق کا نام سن کر بڑے مرزا نے بھی چپکے سے چلے جانے میں خیریت سمجھی۔

آفتاب: زیادہ بچے ہوتے ہیں، ماشاء اللہ گھر تو بھرا بھرا معلوم ہوتا ہے
لیکن ہر وقت کا شور و غل بھی ناک میں دم کر دیتا ہے۔ بوا اب
میں گھر میں ہوں۔ سارے دن کوٹ کہنی کی طرح بیٹھی رہتی ہوں۔
یہ آتے ہیں نماز و ماز پڑھنے۔ گھڑی دو گھڑی بیٹھے۔ بیٹھک میں
چلے گئے۔ خدا کسی کو ایسا اکیلا بھی نہ کرے۔ ہائے کیا کیا
ارمان تھے!

دروازہ کھلتا ہے، اور ایک کولن حقہ لیے ہوئے داخل ہوتی ہے۔

کولن: سلام بیگم صاحب سلام! بڑی بیگم لیجئے میں تو آپکے ہاں حقہ

لے کر جانے والی تھی۔ کہو بیگم مزاج کیسا ہے۔ اللہ رکھے بچے کیسے ہیں؟

محمدی: ہاں بُوا میں تو جیسی ہوں ویسی ہوں کہو بھابی اچھی ہیں۔ سب بچے اچھے ہیں؟ خدا پوتا مبارک کرے۔ بنجیری ہوگی۔ رحیمن لے طشتری خالی کردے۔ (صندوقچی کھولتے ہوئے) آپا ایک ٹکوا پان کا دیدنیا۔

آفتاب: رحیمن میرا حصہ بھی یہیں سے لے لے۔

یہ کہہ کر پان لگانے لگیں۔ محمدی نے دو آنہ کولن کو دیے۔

محمدی: سب کو بہت بہت سلام دعا کہدینا۔ کسی روز طبیعت اچھی رہی تو آؤنگی۔ سب کے ملنے کو دل پھڑک گیا۔ بچے کے دیکھنے کو بہت دل چاہتا ہے۔ اور بھابی سے کہنا کہ بُوا تُم نے تو آنے کی قسم کھالی ہے۔

آفتاب نے پان دیا اور کمر بند سے پیسے نکالکر دو آنے دیے۔

کولن: بیگم صاحب ہماری بیوی بھی بہت یاد کرتی ہیں۔ فرصت ذرا

نہیں ملتی۔ آجکل تو خیر گھر بھرا ہے، سب ہی آئے ہوئے ہیں۔

آفتاب: سلطان دُلھن کو میری طرف سے دعا کہدینا اور کہنا بُوا پوتا مبارک ہو میں جمعہ کو انشاء اللہ آؤں گی۔

کولن رکابیاں لے کر دونوں کو سلام کر کے رخصت ہوتی ہے

محمدی: آپا ہماری بھابی سلطان کا بھی خوب طرز ہے۔ اُن کے میاں نے کبھی چالیس روپیہ سے زیادہ نہیں کمایا، لیکن وہ سلیقہ ہے، ماشاء اللہ سب کچھ کیا۔ بیٹوں کا بیاہ کیا، بیٹیوں کا بیاہ کیا؛ اب بیٹا خدا کے فضل سے اچھا نوکر ہو گیا ہے کوئی سوا سو کا۔ آگے بڑھنے کی بھی امید ہے۔

آفتاب: بہو بھی اچھی ہے (ٹھنڈی سانس بھر کر) اپنی اپنی قسمت ہے۔ ایک ہم ہیں۔ خیر یہ تو ہوگا کہو رضیہ کی بھی کچھ خبر ہے؟ تمہارے ماموں نے اُس کا ایسے چٹ منگنی پٹ بیاہ کیا کہ کسی کو بلایا تک نہیں۔

محمدی: بلایا تک نہیں تو کیا ہوا۔ گھر گھر دوہرا تہرا کھانا بٹوایا تھا۔ شادی اُس غریب کی جس طرح ہوئی وہ بھی اپنی بدنامی کے ڈر سے جلدی کر دی۔

اور اُس میں بھی خدا ان کا بھلا کرے۔

آفتاب: اے ہے یہ بات تھی مجھے تو معلوم ہی نہیں۔ ہاں تو پھر کیا ہوا؟

محمدی: لو تمہیں نہیں معلوم! اب تو سب ہی کو معلوم ہے۔ اُس بچاری کی عمر ہی کیا ہے میری صابرہ سے دو ڈھائی سال بڑی ہے۔ میری شادی کے تو بعد پیدا ہوئی ہے۔ جب چھوٹے ماموں کلکتے سے آئے۔ برسوں بعد آئے تھے۔ ہم بھی جمع تھے۔ نانی اماں بچاری، ہاتھ پاؤں میں رعشہ، سب سے زیادہ خوش تھیں۔ رضیہ کو میں کچھ روز کیلیے ساتھ لے آئی۔ پھر چھوٹی ممانی میکے چلی گئیں۔ لڑکی تین چار مہینے رہ گئی۔ رضیہ ددھیال پر جان دیتی ہے۔ ننھیال سے اُسکو کچھ رغبت نہیں ہے۔ بڑی بہن کا گھر تھا رہ گئی تھی تو کیا ہوا میرے فرشتوں تک کو خبر نہیں۔ جب ماں میکے سے آئیں تو رضیہ اپنے گھر چلی گئی۔ ایک روز رضیہ کا پرزہ آیا، کہ آپا جانی خدا کیلیے جلدی آئیے۔ بس آپا کیا بتاؤں، جب وہاں پہونچی تو چھوٹی ممانی تو آپنے دیکھی ہیں کیسی ہیں۔ وہ ظاہرداری کی باتیں کرتی ہیں

کہ خدا کی پناہ۔ بہت آؤ بھگت کی۔ رضیہ نے چپکے سے ایک پرزہ دیا اور کہا کہ دُولھا بھائی روز ہمارے یہاں آتے ہیں۔ اور اماں بڑی خاطر مدارات کرتی ہیں۔ اور چُپکے چُپکے باتیں ہوتی ہیں۔ کمزار بی کی اور کیا کہتی، یہ بھی بچاری نے بڑی ہمت کی۔ خط دیکھوں تو ہمارے میاں کا رضیہ کے نام۔ وہ عشقیہ خط کہ ناولوں میں بھی نہ ہوگا۔ بس میں جل ہی تو گئی۔ رضیہ کو سمجھا کر کہ تم کچھ نہ کہو میں کسی سے تمہارا نام نہیں لونگی، میں جلتی سُلگتی گھر پہونچی۔ اِن سے ذکر کیا۔ اے آپا خدا کی قسم! دیدوں میں گھُس گئے، کہ کیا بُرائی ہے۔ اور میں تو رضیہ سے شادی کرونگا، چاہے تمہیں طلاق ہی دینی پڑے۔ میں نے کہا میاں، ہوش میں ہو یا بالکل ہی بے ہوش ہو! شریفوں کی لڑکی ہے۔ اگر اُس کا نام بھی لیا تو اُسکے باپ، چچا، بھائی تمہاری بوٹی بوٹی کر دینگے۔ ان خیالوں میں بھی نہ رہنا!

آفتاب: تو تمہاری ممانی نے چپکے چپکے بات پکی کر لی ہو گی اسی لئے تو غرّے سے کہہ رہے ہونگے۔

محمدی: اے اور کیا۔ انھیں اللہ بخشے اماں سے اور مجھ سے ہمیشہ کی دشمنی ہے۔ جب اماں بیمار تھیں تب بھی ان کے سامنے قسمیں کھا کھا کر کہتی تھیں کہ اس وقت تک چین نہ لونگی جبتک محمدی کا گھر اُجڑ وا نہ دیا ہو۔ اور ہم ہی پر کیا بڑی ممانی جاں سے بھی یہی بغض ہے۔ اور چونکہ رضیہ کی منگنی چچا کے ہاں ہوئی تھی تو رُوز رُوز کی لڑائی تھی کہ دشمنوں میں بیٹی نہ دونگی۔

آفتاب (ہنسکر): اور بُوا تمہارے میاں ہی میں کیا رکھا تھا! بیوی والا، بچوں والا، ہاں روپیہ ہر۔ تو تمہارے بڑے ماموں بھی غریب نہ تھے۔ کہیں شریفوں میں بھی ایسی باتیں ہوئی ہیں۔ موئے پنجابیوں میں دو بہنیں اپنی بیٹیاں ایک مرد کو بیاہ دیں تو بیاہ دیں، ہمارے ہاں تو ایسا ہوتا نہیں۔ اب نیا زمانہ ہے جو کچھ نہ ہو تھوڑا ہے۔ ہاں تو پھر کیا ہوا؟

محمدی: جب میں بجوسی اور صلواتیں سنائیں تو خوشامد کرنے لگے کہ میں اُس پر عاشق ہو گیا ہوں۔ ہائے خدا کیلیے میری مدد کرو۔

میری مدد کرنا تمہارا فرض ہے۔ قرآن شریف کھولکر بیٹھ جائیں اور آئتیں پڑھیں کہ میں انکی مدد نہ کرونگی تو بعد مرنیکے یہ ہوگا وہ ہوگا۔ اب اس سے زیادہ کونسی آگ ہوگی؟ یہ ہر وقت کا جلنا، غرضکہ ہر وقت کی یہی باتیں کہ میں پاگل ہو جاؤنگا۔ کمرا بند کیے منہ اوڑھے پڑے ہیں، رضیہ' ہائے رضیہ ہو رہی ہے۔ میں پڑی سب سُن رہی ہوں۔ خدا کی قسم آپا اِس قدر کلیجہ پک گیا ہے کہ یہ روپیہ پیسہ اتو مصیبت معلوم ہوتا ہے۔ روکھی روٹی ہو اور سکھ ہو۔ آپا ذرا ایک پان دینا باتیں کرتے کرتے ہونٹ سُوکھ گئے۔

پاس صراحی رکھی تھی اُس میں سے پانی نکال کر پیا۔ آفتاب نے پان کھایا اور محمدی کو بھی دیا۔

غرضکہ یہی حالت جاری ہی' اور وہ عشقیہ لفظ اُس معصوم کنواری بچی کیلیے استعمال کریں' اور میں سب سُنوں اور دلمیں گھٹوں اور چھوٹی ممانی ہیں کہ وہی سلوک وہی خاطر۔ رضیہ تمہارے

دُولھا بھائی آلے ہیں، پان دو، الائچی دو۔

آفتاب: اچھا تو یہ کہو کہ سب کچھ کیا دھرا تمہاری ممانی ہی کا تھا!

محمدی: اور کیا! وہ لڑکی گھنٹوں روئے۔ کہیں میں ملجاؤں تو دلکا بخار نکال لے۔ ایک مہینہ تو میں چُپ رہی پھر ایک دن دونوں ماموں مجھے ملنے آئے۔ میں نے کہا کیوں ماموں جان کیا رضیہ کی منگنی چھُٹ گئی؟ دونوں بھائی چکرا گئے۔ پھر میں بھری بیٹھی تھی میں نے سب کچّا چٹھا کہہ ڈالا۔ دونوں میں کچھ صلاح ہوئی ہوگی۔ تیسرے دن رضیہ کا بیاہ ہوگیا۔

آفتاب: اللہ اللہ خیر صلاّ!

محمدی: لیکن بوا جب سے یہ گھر میں نہیں گھُسے۔ ہر وقت چاڈری میں پڑے رہتے تھے۔ اور میں تو خوش تھی، اللہ گواہ ہے جس روز یہ اِدھر اُدھر چلے جاتے ہیں تو میں چین کی نیند سوتی ہوں۔ روز یہی ہے کہ تم تو روز روز کی بیمار ہو میں کبتک صبر کروں، میں دوسرا بیاہ کرتا ہوں۔ اور پھر یہ ضد ہے کہ تم میرا بیاہ کرواؤ۔

شرع میں چار بیویاں جائز ہیں تو میں کیوں نہ کروں۔ میں نے تو کہا بسم اللہ کرو۔ اب سال بھر بعد صابرہ کی رخصت ہے۔ بادا بیٹوں کا ساتھ ساتھ ہوجائے۔ ایک گود میں نواسا کھلانا، دوسری میں نئی بیوی کا بچہ۔ بس لڑنے لگتے ہیں کہ عورتیں کیا جانیں خُدا نے اِنکو حِس ہی نہیں دی۔ میں تو کہتی ہو کہ تم میں سارے مردوں کی حِس بھری ہوئی ہے اب کیا......

آفتاب (ٹھوک کر)**:** محمدی بیگم جہاں دیکھو یہی آفت آئی ہوئی ہے۔ مَردوں نے تو وہ گرہ جیتا ہے کہ اَٹ بھی ماریں پَٹ بھی ماریں۔ اب یہ ظلم ہے یا نہیں کہ بیاہ بھی کرونگا اور یہ بھی بیوی ہی کمبخت......

محمدی: اِسی سے تو میں جَل جَل کر اپنے مرنے کی دعا مانگتی ہوں۔ ایک تو ہر وقت کی اپنی بیماری، رُوز رُوز کا بچّوں کا رنجھنا الگ۔ خیر بڑے بچے تو ماشاء اللہ خاصے تندرست ہیں ہاں یہ چھوٹے بچے آئے دن بیمار رہتے ہیں۔ اِن سب باتوں نے اب جینے کا لُطف تو بالکل کھو دیا۔ اور یہ تو میں جانتی ہوں کہ یہ دوسرا بیاہ کریں اور

پر کریں۔ یہ ہر وقت کا دھڑکا الگ۔ خُدا اس سے پہلے تو مجھے اُٹھالے کہ میں سوکن کا مُنہ دیکھوں۔ اور سوکن کے ڈر سے بُوا میں نے کیا کیا نہ کیا، دو دفعہ اپریشن بھی کروایا۔

آفتاب: اے ہاں ہم نے تو سُنا تھا کہ تم نے کچھ ایسا کروالیا ہے کہ اب تمہارے ہاں بچے نہ ہونگے۔

محمدی: یہ تم سے کس نے کہا؟ اصل بات یہ تھی کہ رحم اور نیچے کا سارا جسم جھک آیا تھا تو اُس کو ٹھیک کروایا گیا تھا کہ پھر سے میاں کو نئی بیوی کا لُطف آئے۔ اے بُوا جس عورت کے ہر سال بچے ہوں اُس کا بدن کبتک ٹھیک رہیگا؟ پھر کھسک گیا۔ پھر میرے بیچھے پڑ کر ڈرا دھمکا کر مجھے ذبح کروایا۔ اور پھر بھی خوش نہیں ہیں۔

اذاں کی آواز پاس کی مسجد سے آتی ہے

آفتاب: اے ہے بُوا ظہر کا وقت ہو گیا۔ باتوں میں ایسی مشغول ہوئی کہ سب کچھ بھول گئی (کسنا باندھتے ہوے) اب نماز پڑھکے

ہی جاونگی۔ تمہارے بھائی بچارے انتظار کر رہے ہونگے۔

محمدی: اے آپا آج تم آگئیں تو اتنا دِل کا بخار بھی نکل گیا۔ ذرا جلدی جلدی ہو جایا کرو۔ میں تو بیمار ہوں نہ کہیں آنیکی رہی نہ جانیکی۔

لے رحیمن! رحیمن!! گل شبو!

رحیمن آتی ہے

محمدی: جا، بڑی بیگم صاحب کو وضو کروا اور صحنچی میں چوکی پر جانماز بچھادے۔

پردہ

———

جوانمردی

وہ میری بیوی جارہی۔ مگر اُسکے لبوں پر اُس مسکراہٹ کا نام تک نہیں جیسا کہ لوگوں نے میری تسکین قلب کیلیے مجھسے کہا تھا۔ بس ہڈیوں کا ایک ڈھانچا ہے۔ اسکی بھیانک صورت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک مہلک بیماری کا شکار ہے اور موت کا خوف اُس پر طاری ہے۔ اسکی آنکھوں میں میرے لیے اب لطف اور پیار کی جگہ بیگانگی اور نفرت ہے۔ میں مستحق ہی اسکا تھا۔ اِس نفرت کی وجہ، وہ نازائیدہ تجربہ ہے جس کا سر اُسکے کولے کی ہڈیوں میں ابتک پھنسا دکھائی دیتا ہے جس کی وجہ سے اُسکی جان گئی۔ یہ بھلا کسے خیال ہو سکتا تھا کہ میری بیوی کو مرتے وقت مجھسے نفرت ہوگی۔ مین نے اُس کو تکلیف اور موت سے بچانے کیلیے کون سی بات اُٹھا رکھی تھی۔ مگر نہیں۔ میں ہی اُسکی موت کا

باعث ہوا، میں نے ہی اُس کو درد اور دُکھ پہونچایا۔ مَردوں کی جہالت اور حماقت کی کوئی انتہا نہیں۔ مگر یہ بھی کہنا صحیح نہیں کہ میں جہالت اور حماقت کا شکار تھا۔ ہاں یہ سراسر غلط ہے۔ دراصل میں غرور کے پنجہ میں گرفتار تھا جس کا مجھے اعتراف ہے۔

ہماری شادی ایسی عمر میں ہوئی تھی جب ہم میں ایک دوسرے کے جذبات سمجھنے کی صلاحیت تک نہ تھی۔ لیکن بعد میں جو حادثہ پیش آیا اسکا الزام میں قسمت، یا ایسے حالات پر جن پر مجھے کوئی قابو نہ تھا، نہیں رکھنا چاہتا۔

مجھے اپنی بیوی سے کبھی محبت نہیں ہوئی۔ اور ہوتی بھی تو کیسے؟ ہم دو مختلف دائرہ زندگی میں گردان تھے۔ میری بیوی پُرانے زمانے کی تنگ و تاریک گلیوں میں اور میں نئے زمانے کی صاف اور چوڑی پکی سڑکوں پر۔ لیکن جب میں دوسرے ملکوں میں گیا اور اُس سے کئی برس تک جُدا رہا تو کبھی کبھی میرا دل اُسکے لیے بیچین ہوتا تھا۔ وہ اپنے چھوٹے سے مستحکم پُرانے قلعہ میں تھی، اور میں زندگی کی دَوا دوش فضول

اور بے فیض عشقبازی سے تنگ اگر کبھی کبھی اُس پاک و باوفا عورت کا
خواب دیکھا کرتا تھا جو بلا کسی معاوضہ کے مجھ پر سے سب کچھ نثار کرنے کیلیے
تیار تھی۔ جب میری یہ کیفیت ہوتی تو بیتابی کے ساتھ مجھے اُس سے ملنے
کی خواہش ہوتی۔ ایک دفعہ مجھ پر ایسی ہی کیفیت طاری تھی کہ مجھے اُسکا
ایک خط ملا۔ میں بیقرار ہوگیا اور فوراً چھ ہزار میل کے فاصلہ سے وطن
کی طرف چل پڑا۔ اُسنے خط میں لکھا تھا:۔ " میں نے ابھی تکیہ کے
نیچے سے پھر آپ کا خط نکال کر پڑھا۔ بہت مختصر ہے۔ غالباً آپ
اپنے کام میں مشغول ہونگے۔ مگر خیر مجھے اسکی کوئی شکایت نہیں۔ بس
آپکی مجھے خیریت معلوم ہوتی رہے اور آپ اچھے رہیں اور خوش رہیں
میرے لیے یہی کافی ہے۔ جب میں بیمار ہوں سوائے اسکے کہ آپ
کو یاد کروں اور ان عجیب عجیب چیزوں اور نئے نئے لوگوں کا خیال کروں
جن سے آپ وہاں ملتے ہونگے، مجھے اور کام نہیں۔ مجھے چلا نہیں
جاتا اس وجہ سے پلنگ پر پڑی پڑی طرح طرح کے خیال کیا کرتی ہوں۔
کبھی تو اس میں لطف آتا ہے اور کبھی اس سے سخت تکلیف ہوتی ہے

جب لوگ میری صحت کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں اور مجھے اظہار
ہمدردی کرتے ہیں اور نصیحت کرتے ہیں تو مجھے بڑی کوفت ہوتی ہے۔
یہ لوگ یہ تک نہیں سمجھتے کہ مجھے کیا روگ ہے۔ انھیں صرف اپنی تسکین
قلب کیلیے میری حالت پر رحم آتا ہے۔ اپنے والدین پر بھی میں بار ہوں
وہ اپنے جی میں خیال کرتے ہونگے کہ باوجود میری شادی ہو جانے کے میں ایسی
بدنصیب ہوں کہ اُنکے گلے پڑی ہوں۔ اِس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں ہر وقت
اس کوشش میں رہتی ہوں کہ بہت زیادہ مایوسی اور رنج کا اظہار نہ کروں
اور میرے والدین ایسی کوشش کرتے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اِنھیں
میری بیماری کی وجہ سے بڑا تردُد اور فکر ہے۔ غرض دونوں طرف بناوٹ
ہی بناوٹ ہے۔ میں آپ سے کسی بات کی شکایت کرنا نہیں چاہتی اور
نہ آپکے کام میں هارج ہونا چاہتی ہوں۔ آپ مجھے بھول نہ جائیں اور
کبھی کبھی خط لکھ دیا کریں۔ میرے لیے یہی بہت ہے۔ بلکہ کبھی کبھی
تو مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ آپ کا مجھے دور ہی رہنا بہتر ہے۔ مجھے ڈر
اِس بات کا ہے کہ جیسے بیماری کے بعد سے یہاں میں قریب قریب سب سے

ناآشناسی ہوگئی ہوں ویسے ہی میں کہیں آپ کو بھی نہ کھو بیٹھوں۔ دن رات میری بُری حالت دیکھکر کہیں آپکا دل بھی میری طرف سے نہ ہٹ جائے۔ وہاں سے تو آپ محض اسکا تصور کر سکتے ہیں۔ اور میں آپ کو اپنا وہ کامل دمساز تصور کر سکتی ہوں جس کی میرے دل کو تمنا ہے"۔

جب مجھے یہ خط ملا تو مجھ پر عشق و محبت کی ایک لہر سی دوڑ گئی، گو کہ وہ بیمار تھی اور اُسے روگ لگ گیا تھا مگر اُس کو سینے سے لگانا میرا فرض تھا۔ میں یہ ثابت کر دینا چاہتا تھا کہ میری محبت میں کوئی بات حائل نہیں ہو سکتی۔ میں چاہتا تھا کہ اُسے معلوم ہو جائے کہ میں ہی وہ کامل دمساز ہوں جسکی اُسے جستجو تھی۔ میں نے اپنے کو قصوروار اور بُرا قرار دیا اور اُس کو معصوم اور نرل، جیسی اُسنے میرے ساتھ خاکساری برتی اور میری خدمتگزاری کی میرا بھی فرض تھا کہ میں اُسکے ساتھ ویسا ہی سُلوک کروں۔ یہ تہیہ کر کے میں اپنا کام چھوڑ کر گھر کی طرف چل کھڑا ہوا۔

میں ابھی راستہ ہی میں تھا کہ میرے جذبات میں تبدیلیاں ہونے لگیں۔ وہ شروع کا سا پاک جذبہ بالکل غائب ہوگیا۔ اور روزمرہ کی چھوٹی

چھوٹی باتوں کی طرف میرے خیالات دوڑنے لگے، مثلاً روزی کمانے کی میں کون صورت نکالونگا۔ اپنے دوستوں میں سے کن کن سے ملاقات جاری رکھونگا۔ اپنے سُسر اور ساس سے کس طرح ملونگا۔ ان سے صاف صاف باتیں کروں یا یہ کہ اُن کی طرف سے بیرخی برتوں۔ وغیرہ وغیرہ۔ صرف اپنی بیوی سے ملنے کی پہلے کی سی تمنا باقی نہ رہی۔ یہ ہی نہیں بلکہ ذرا ذرا سے روزانہ زندگی کے مسئلوں نے میری تمناؤں اور ولولوں کا خاتمہ کر دیا۔ گھر پہونچنے پر یہ مسائل مکروہ حقیقتوں سے بدل گئے، جن سے گریز نا ممکن تھا۔ پُرانے زمانے کی جن جن دلفریبوں کی میں نے اپنے ذہن میں تصویر کھینچی تھی اُن کا کہیں پتہ بھی نہ تھا۔ بجائے اسکے میں نے خود کو ایک تنگ و تاریک، گندی، ظلم اور جہل سے لبریز دُنیا میں بند پایا۔ اسٹیشن پر جو لوگ مجھ سے ملنے آئے اُن میں اکثر بیہودہ، بدمعاش، تنگ نظر اور ناکارے قسم کے آدمی تھے اُن سب نے بہت خوشی کے ساتھ میرا استقبال کیا، مجھے ہار پہنایا گیا، مجھ پر فقرے کسے گئے، وہی پُرانے ناشائستہ مذاق ہوئے اور دوسروں کی عیب جوئی کی گئی۔ کئی دن تک جلسوں اور دعوتوں کا سلسلہ رہا۔ اسکے

بعد کہیں اُن لوگوں سے نجات ملی۔ اس درمیان میں مَیں اپنی بیوی سے صرف تھوڑی تھوڑی دیر کیلیے مل سکا۔ لیکن اسکے تیل سے چپکے ہوئے بال، اُس کا لاغر جسم اور زرد چہرہ؛ دعوتوں، رقص و سرود کے جلسوں اور ادھر اُدھر بات چیت کے وقت بھی بار بار میری نظر کے سامنے آجاتا تھا۔

جب سب مہمان رخصت ہو گئے تو میں اپنی بیوی کے پاس گیا اور اُسکے قریب پلنگ پر جا کر بیٹھا۔ وہ ساکت لیٹی رہی اور میری طرف اُسنے نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ میں تھوڑی دیر تک تو اسکی ہر سانس کے ساتھ اُسکے سینہ کا اُتار چڑھاؤ دیکھتا رہا۔ پھر میں نے اُس کا نحیف ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور کچھ دیر تک ہم دونوں یونہیں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر میں بولا: "لیجئے اب تو میں آپ کے پاس آگیا، کچھ باتیں کیجئے، آپ اتنی چپ کیوں ہیں"۔ اُسنے جواب دیا "میں کیا باتیں کروں۔ خیر آپ آگئے"۔

میں نے دفعتاً یہ محسوس کیا کہ اِس طرح کام نہیں چلنے کا۔ میں نے شروع میں جو تہیہ کیا تھا وہ مجھے یاد آگیا اور میں نے جلدی سے کہا۔ "واہ! ابھی کہنا تو مجھے بہت کچھ ہے۔ اتنے دن جو میں یہاں نہیں رہا تو آپ کیا کرتی ہیں

اور کیسی رہیں سب مجھے بتائیے۔ آخر اتنے دن تک آپنے مجھسے بات چیت نہیں کی اب اُسکی کسر نکالئے۔ یاد ہے آپ کو۔ آپنے مجھے ایک دفعہ خط میں لکھا تھا کہ آپ کو ایک ہمدم و دمساز کی جستجو ہے۔ میں ہی وہ شخص ہوں اور اب آپکے پاس اسلئے آیا ہوں کہ ہر وقت آپکے ساتھ رہوں اور کبھی آپ سے جُدا نہ ہوں"۔

مگر میری تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔ میری باتوں سے ظاہر تھا کہ رٹے ہوئے سبق کی طرح ادا کی ہیں اور اُن سے میری بیوی کی کوئی تسلی نہیں ہوئی۔ کچھ دیر تک مجھے یہ اُمید رہی کہ اُسے اِس کا شاید احساس نہیں ہوا۔ مگر وہ گھبراہٹ اور بے چینی سے میری ٹوپی اُٹھا کر ہاتھوں سے ملنے دلنے لگی اور پھر ایسی گفتگو شروع کی کہ مجھے اپنی ناکامیابی کا یقین ہو گیا۔ اُسنے کہا "بھلا میں کیا کہوں؟ یہاں تو جیسے دن ویسی رات۔ لیکن آپ کیوں چپ ہیں؟ آپ کو نئے نئے تجربے ہوئے ہونگے۔ اہم امور سے سابقہ پڑا ہوگا۔ آپ مجھے اُن سب باتوں کا تذکرہ کیجئے۔ وہاں کی عجیب عجیب چیزیں۔ طرح طرح کی مشین۔ قسم قسم کے لوگ، نئی زندگی؛

آپ لکھا کرتے کہ آپ کو ان سب کے بارے میں مجھے لکھنے کا وقت نہیں۔ لیکن اب تو آپ میرے پاس ہیں۔ اب تو آپ کو وقت ہے۔"

یہ اُسنے جان کر میری خود بینی پر حملہ کیا۔ اب مجھے معلوم ہو گیا کہ برسوں کی جدائی نے ہمارے تعلقات میں مطلقاً کوئی فرق پیدا نہیں کیا۔ ہم پہلے کی طرح اب بھی ایک دوسرے نا آشنا تھے اور ایک دریا کے دو مختلف کناروں پر اجنبی کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ ہم نے پھر ایک دوسرے کے ساتھ ریاکاری شروع کر دی۔

میں نے کہا "ہاں ہاں مجھے تو آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ ہم دونوں ملکر کیا کیا کرینگے، یہ طے کرنا ہے۔ لیکن پہلے آپ جلدی سے اچھی تو ہو جائیے۔ جب آپ اچھی ہو جائیں گی تب ہم اسکے بارے میں گفتگو کرینگے۔ ابھی تو آپ کو خاموشی سے آرام کرنا چاہیے۔ آپ اپنے دل و دماغ پر زور نہ ڈالئے۔ میرے آنے کی وجہ سے غالباً آپ کو تکان ہو گیا۔ آپ آرام کیجئے اور زیادہ سوچئے مت۔ اچھا میں اب جاتا ہوں آپ سو جائیے۔"

میں نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور وہاں سے اُٹھ کر چلا آیا۔

اسکے بعد نہ تو میں نے اُس سے زیادہ رابطہ بڑھانے کی کوشش کی اور نہ کسی خاص بات پر زیادہ دیر تک گفتگو ہی کی۔ دن میں ایک دو دفعہ اُسے دیکھنے جایا کرتا، دریافت کرتا کہ اسکی صحت کیسی ہے اور ایسی ہی ادھر ادھر کی باتیں کر کے چلا آتا اور اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ اتفاق سے میرا کام بھی ان دنوں کچھ اچھا نہیں چل رہا تھا اور مجھے فرصت کافی تھی۔

رفتہ رفتہ میں پھر اپنے پُرانے دوستوں کی صحبت میں رہنے لگا، اور ان کی لغو اور فضول عادتیں مجھ میں بھی آگئیں۔ تاش، شراب، اور بے سر و پا باتوں کا سلسلہ جاری رہنے لگا۔ ہم اپنے کو موسیقی کا بھی ماہر سمجھتے تھے اور شہر کی نامور گانے والیوں کے سرپرست بن بیٹھے۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ میں نے ایک عورت بھی رکھ لی تھی۔ ہم نے بے معنی اور بے مقصد زندگی بسر کرنے کی یہی ترکیبیں نکالی تھیں۔ ہم میں سے جو لوگ غیر ممالک کا سفر کر آئے تھے وہ اپنی جواں مردی اور عاشقی کی داستانیں دوسروں کو سُنا سُنا کر اُن پر رعب جماتے تھے۔

لیکن مجھے اپنی بیوی سے چھٹکارا پانا ناممکن تھا۔ اُس کی صحت کی خرابی کی وجہ سے میرے پاس مزاج پرسی کیلیے خطوط، اور دوستوں اور رشتہ داروں کا ایک سلسلہ قائم رہتا۔ کوئی مجھے نصیحت کرتا تو کوئی فضیحت، کوئی دلاسا دیتا تو کوئی اظہار ہمدردی کرتا، ان سب باتوں سے میری زندگی عذاب ہوگئی۔ میرے ساس اور سُسر کو میری آزادہ روی بہت کھلتی تھی، وہ ڈرتے تھے کہ کہیں میں اُنکی لڑکی کو بالکل چھوڑ نہ دوں۔ اِدھر میری والدہ صبح شام مجھ سے دوسری شادی کرلینے پر مُصر تھیں۔ خاندان میں دو ایسے گروہ بن گئے جنھیں ایک دوسرے سے سخت عداوت تھی - دونوں مجھے اپنی طرف کھینچنے کی ہر وقت کوشش کرتے رہتے تھے۔

لیکن باوجود والدہ کے اصرار کے میں دوسری شادی کرنے پر راضی نہیں ہوا۔ آخرکار لوگوں نے میری مردانگی میں شک کرنا شروع کیا اور طرح طرح کی چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ اب تو مجھے رہا نہ گیا اور میں نے یہ تہیّہ کرلیا کہ کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیئے۔

میں اپنی سُسرال گیا اور وہاں جاکر کہا کہ "آپ کی لڑکی بیمار ویمار کچھ بھی نہیں۔ یہ سب خواہ مخواہ اُسے اپنے یہاں روکنے کے بہانے ہیں۔ میں اُسے اپنے ساتھ لیئے جاتا ہوں"

اپنی بیوی سے بھی میں نے کہا کہ "آپ بالکل بیمار نہیں۔ کم ازکم ایسی بیمار نہیں جیسا یہاں لوگ آپ کو بنانا چاہتے ہیں۔ یہ سب آپکے والدین کی چال ہے، یہ بات کچھ آپ سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ آپ میرے ساتھ چلکر رہیئے تب پتہ چلے گا کہ آپ کو کیا بیماری ہے۔

پہلے تو میری صاف گوئی اُنکی کچھ سمجھ میں نہیں آئی مگر تھوڑی بہت تکرار کے بعد وہ میرے ساتھ چلنے پر راضی ہوگئی۔

ہم دونوں نے ایک لمبا سفر کیا۔ اور دور پہاڑوں پر جاکر رہنے لگے۔ برفستان کی خشک اور تازہ ہوا میں دُور دُور ٹہلنے کے لیے نکل جاتے۔

جب تھوڑے دنوں بعد میری بیوی کی صحت ٹھیک ہوگئی تو میں اُسے لے کر گھر آیا۔ میرے دوستوں اور رشتہ داروں نے

میں اپنی سسرال گیا اور وہاں جاکر کہا کہ " آپ کی لڑکی بیمار ویمار
کچھ بھی نہیں۔ یہ سب خواہ مخواہ اُسے اپنے یہاں روکنے کے بہانے
ہیں۔ میں اُسے اپنے ساتھ لیے جاتا ہوں "۔

اپنی بیوی سے بھی میں نے کہا کہ " آپ بالکل بیمار نہیں۔ کم از کم
ایسی بیمار نہیں جیسا یہاں لوگ آپ کو بنانا چاہتے ہیں۔ یہ سب آپکے
والدین کی چال ہے، یہ بات کچھ آپسے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ آپ
میرے ساتھ چلکر رہیے تب پتہ چلے گا کہ آپ کو کیا بیماری ہے۔

پہلے تو میری صاف گوئی اُنکی کچھ سمجھ میں نہیں آئی مگر تھوڑی بہت
تکرار کے بعد وہ میرے ساتھ چلنے پر راضی ہوگئی۔

ہم دونوں نے ایک لمبا سفر کیا۔ اور دور پہاڑوں پر جاکر رہنے
لگے۔ برفستان کی خنک اور تازہ ہوا میں دُور دُور ٹہلنے کے لیے
نکل جاتے۔

جب تھوڑے دنوں بعد میری بیوی کی صحت ٹھیک ہوگئی
تو میں اُسے لے کر گھر آیا۔ میرے دوستوں اور رشتہ داراں نے

جب ہمیں دیکھا تو میرے لیے یہ بڑے فخر کا موقع تھا۔ مگر ان کے
دلوں میں شک باقی رہ گیا۔ وہ پورے ثبوت کے لیے کسی اور
چیز کے خواہاں تھے۔ لیکن مجھے اپنی فتحیابی کا پورا یقین تھا۔
ایک مہینے کے بعد دوسرا مہینہ آہستہ آہستہ گزرتا جاتا تھا اور
میری بیوی کا پیٹ بڑھتا جاتا تھا۔

میری حالت اُس مالی کی سی تھی جو اپنے لگائے ہوئے درختوں
پر کلیوں کو کھلتے ہوئے دیکھکر باغ باغ ہوتا ہے۔ ہر ہر دن، ہر ہر
لمحے کے بعد میری کامیابی زیادہ نمایاں ہوتی جاتی۔ لیکن میری بیوی
خاموش رہتی۔ میں سمجھتا تھا کہ اِسکا سبب غالباً زچگی کی گھبراہٹ
اور پریشانی ہے۔ آخرکار اُسکو دردِ زہ شروع ہوا۔ گھنٹوں تک کرب اور
بے چینی کا عالم رہا۔ جسم شدت تکلیف سے تڑپ رہا تھا اور کسی
پہلو اُسے چین نہیں تھا۔ روح تک معلوم ہوتا تھا کہ آہ و فریاد کر رہی
ہے۔ لیکن اُنکی بیکلی اور تڑپ، اُنکی آہ و زاری ان سب سے میری
جوانمردی کا ثبوت مل رہا تھا۔